HEC کے معیار کے مطابق

ISSN:2788-4066-Online
ISSN:2518-9794-Print
جلد:۳ شمارہ:۵ جنوری۔جون ۲۰۱۸ء

ششماہی علمی و تحقیقی مجلہ

العرفان

فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز اینڈ شریعہ
منہاج یونیورسٹی، لاہور

ششماہی علمی و تحقیقی مجلہ العرفان جنوری۔جون ۲۰۱۸ء فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز اینڈ شریعہ، منہاج یونیورسٹی، لاہور

ISSN:2788-4066-Online
ISSN:2518-9794-Print
Vol:5, Issue:3 Jan-June 2018

(Biannual Abstracted Research Journal)

AL-IRFAN

Faculty of Islamic Studies & Shariah
Minhaj University Lahore

www.mul.edu.pk/crd

العرفان

(ششماہی، علمی و تحقیقی مجلہ)

جلد:3 شمارہ:5 جنوری تا جون 2018

مجلسِ ادارت

سرپرست اعلی	ڈاکٹر حسن محی الدین قادری، چیئرمین سپریم کونسل، منہاج القرآن انٹرنیشنل، لاہور
سرپرست	پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم غوری، وائس چانسلر، منہاج یونیورسٹی، لاہور
مدیر اعلیٰ	پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم رانا، ڈین فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز اینڈ شریعہ، منہاج یونیورسٹی، لاہور
مدیر	ڈاکٹر ممتاز الحسن، پرنسپل، کالج آف شریعہ اینڈ اسلامک سائنسز، لاہور
نائب مدیر	پروفیسر ڈاکٹر ثمر فاطمہ، پرنسپل منہاج کالج فار ویمن، منہاج یونیورسٹی، لاہور
معاون مدیر برائے اُردو	ڈاکٹر شبیر احمد جامی، چیئرمین شعبۂ علوم اسلامیہ، منہاج یونیورسٹی، لاہور
معاون مدیر برائے عربی	ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی، چیئرمین شعبہ عربی، منہاج یونیورسٹی، لاہور

فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز اینڈ شریعہ، منہاج یونیورسٹی، لاہور

برائے رابطہ فون: 0321-4457966, 03344053291

'ای میل' ایڈریس: alirfan@mul.edu.pk

مجلسِ مشاورت (بین الاقوامی)

١. الأستاذ الدكتور محمد عبد الرحيم البيومي، عميد كلية أصول الدين، جامعة الأزهر، زقازيق، مصر
٢. الدكتور بان حميد الراوي، رئيس قسم علوم القرآن، كلية التربية للبنات، جامعة بغداد، عراق
٣. الدكتور غلام محمد قمر الأزهري، أمريكة
۴. پروفیسر ڈاکٹر شاہ کوثر مصطفی، یونیورسٹی آف ڈھاکہ، بنگلادیش
۵. پروفیسر ڈاکٹر درمش بلگر، استنبول یونیورسٹی، ترکی
۶. پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد سلیم، برطانیہ
۷. ڈاکٹر محمد رفیق حبیب، گلاسگو، برطانیہ
۸. ڈاکٹر حافظ منیر، برطانیہ
۹. ڈاکٹر محمد یعقوب بشوی، المصطفی انٹرنیشنل یونیورسٹی، قم ایران

مجلسِ مشاورت (قومی)

١. پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، چیئرمین ہجویری چیئر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
٢. پروفیسر ڈاکٹر نوراحمد شاہتاز، ڈائریکٹر، شیخ زید اسلامک سنٹر، کراچی یونیورسٹی، کراچی
٣. پروفیسر ڈاکٹر ہمایوں عباس، شعبہ علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
۴. پروفیسر ڈاکٹر خالق داد ملک، صدر شعبہ عربی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
۵. پروفیسر ڈاکٹر سلطان شاہ، ڈین علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور
۶. پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید خان عباسی، شعبہ عربی واسلامک سٹڈیز، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
۷. پروفیسر ڈاکٹر محمد عبد اللہ صالح، شیخ زاید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
٨. ڈاکٹر حافظ محمد سجاد، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ علوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
٩. ڈاکٹر شمس الرحمٰن، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
١٠. ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، اسسٹنٹ ڈائریکٹر اقبال اکادمی، ایوان اقبال، لاہور
١١. ڈاکٹر ظہور اللہ الازہری، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ یونیوسٹی آف لاہور
١٢. ڈاکٹر عاطف اسلم راؤ، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، کراچی یونیورسٹی

تعارف شرکاء

شفاقت علی	پی۔ایچ۔ڈی اسکالر، یونیورسٹی آف لاہور
ڈاکٹر فیض اللہ بغدادی	سینئر ریسرچ اسکالر، فرید ملت ریسرچ انسٹیٹیوٹ، لاہور
سید فیض الحسن ہمدانی	ایم۔فل اسلامک سٹڈیز، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد
حافظ محمد عمران	پی ایچ ڈی اسکالر ،شعبہ علوم اسلامیہ ،لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور
محمد انوار الحسنین	ایم۔فل سکالر، منہاج یونیورسٹی، لاہور
سید کاظم محمود کاظمی	ایم۔فل اسلامک سٹڈیز، امپیرئل کالج آف بزنس سٹڈیز، لاہور
احمد رضا	ایم۔فل اسلامک سٹڈیز، منہاج یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر غلام حسین	ایلیمنٹری سکول ٹیچر، دلہکے مہار (بصیر پور، اوکاڑہ)
حافظ سید مبشر حسین کاظمی	لیکچرار یونیورسٹی آف لاہور
رابعہ الصالحہ	پی ایچ ڈی سکالر، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد
ضیاء المصطفی مکی الازہری	لیکچرار شعبہ اسلامک سٹڈیز، منہاج یونیورسٹی، لاہور
فرح ناز	پی۔ایچ۔ڈی اسکالر ،شعبہ علوم اسلامیہ ، یونیورسٹی آف لاہور
Hafiz Umair Gulzar	M.Phil Scholar, GC University, Lahore
M.Iqbal	PhD Scholar, Minhaj University Lahore
Dr. Hassan Shakeel Shah	Associate Professor, Department of Islamic Thought and Civilization, UMT, Lahore
Rafia Kiran Zahid	M.Phil Scholar
Dr. Sarwar Siddique	Assistant Professor, University of veterinary & Animal Sciences, Lahore

فہرست مقالہ جات

عنوانات	مقالہ نگار	صفحہ نمبر
اداریہ	مدیر اعلی	
عصر حاضر کا اَخلاقی اِنحطاط (نوعیت، اسباب اور اثرات کا تحقیقی جائزہ)	شفاقت علی/ڈاکٹر فیض اللہ بغدادی/سید فیض الحسن	۱
تجدید دین:وسعت اور محدودیت	حافظ محمد عمران/محمد انوار الحسنین/سید کاظم محمود کاظمی	۳۷
ڈاکٹر وھبہ زحیلی کی علمی خدمات(عصر حاضر میں استفادہ کی اہمیت و ضرورت)	احمد رضا/ڈاکٹر غلام حسین/سید مبشر حسین کاظمی	۵۵-۷۷
حالتِ جنگ میں انسانی حقوق کی پاسداری	رابعہ الصالحہ/ضیاء المصطفی مکی	۷۸-۹۸
اعلیٰ اخلاقی اقدار اور حُسنِ معاشرت کی اہمیت	فرح ناز	۹۹
Holy Injil Luke (A New Translation from Original Greek Text with Commentary)	Hafiz Umair Gulza/ M.Iqbal/ Dr Hassan Shakeel Shah	1
The Panoptical View of Bulleh's Punjab through His Verse	Rafia Kiran Zahid/ Dr. Sarwar Siddique	16

نوٹ: ادارہ مقالہ نگار کے پیش کئے ہوئے حقائق کی ذمہ داری قبول کرنے کا پابند نہیں ہو گا۔

العرفان مجلہ: اندرون ملک قیمت:300روپے فی شمارہ/500روپے سالانہ

بیرون ملک قیمت:30ڈالر فی شمارہ/50ڈالر سالانہ

Author Guidelines

مقالہ نگاران سے ضروری گزارشات

۱. ''العرفان'' میں قرآن و حدیث، سیرت النبی، تصوف، فقہ، تقابل اَدیان، اسلامی فلسفہ اور اسلامی تہذیب و تمدن سے متعلقہ موضوعات پر اردو، عربی، اور انگریزی زبان میں علمی و تحقیقی غیر مطبوعہ مقالات شائع کئے جاتے ہیں۔ تاہم جدید طرز کے موضوعات قابلِ ترجیح ہوں گے۔

۲. علمی مقالہ پہلے کسی مجلّے میں شائع نہ ہوا ہو اور نہ ہی اشاعت کیلئے کہیں اور جمع کرایا گیا ہو۔

۳. تمام مقالات A-4 سائز کے کاغذ پر (M.S Word) میں ایک جانب بغیر اَغلاط کے کمپوز کروا کر بھیجے جائیں۔

۴. تحقیقی مقالہ مآخذ و مصادر سمیت 6000 سے 7000 الفاظ پر مشتمل ہو۔

۵. تحقیقی مقالہ Microsoft word میں کمپوز کیا گیا ہو، جس میں اُردو عبارت کے لئے Jameel Noori Nastaleeq استعمال کیا گیا ہو، جبکہ عربی عبارت کے لئے Traditional Arabic استعمال کیا گیا ہو اور انگریزی کے لئے Times New Roman استعمال کیا جائے۔

۶. عنوان کا فاؤنٹ سائز 25، سب ہیڈنگز (Sub Headings) کا سائز 18، متن کا فاؤنٹ سائز 14 ہو، جبکہ فٹ نوٹ (Foot Note) کا سائز 12 ہو گا۔

۷. مقالہ میں درج شدہ تمام حواشی و حوالہ جات (Auto Arrange) ہوں اور مقالہ کے فٹ نوٹ (Foot note) میں ہی درج کیے جائیں۔

۸. مقالے کے آغاز میں انگریزی میں خلاصہ (Abstract) لازماً لکھا جائے جو 150 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔ علاوہ ازیں Abstract کے ساتھ Keyword بھی لکھے جائیں۔

۹. مقالہ نگار اپنے نام کے انگریزی ہجے، موجودہ عہدہ، نیز مکمل پتا اور رابطہ نمبر بھی اِرسال کرے۔

۱۰. حوالہ جات میں APA 6th Edition Format سٹائل کو مدِ نظر رکھا جائے۔ نیز حوالہ جات اور مآخذ و مصادر مقالے کے آخر میں فراہم کئے جائیں۔

۱۱. مقالہ نگار زبان کی صحت اور اسلوب نگارش کے حسن کو پیش نظر رکھے۔

۱۲. انگریزی مقالے میں شامل غیر انگریزی الفاظ کو لکھتے وقت (Transliteration) کے لیے "العرفان" مجلہ کے جدول کو مد نظر رکھا جائے۔ اسی طرح اردو مقالے کے انگریزی خلاصے میں شامل غیر انگریزی الفاظ کی نقل حرفی کے لیے بھی مذکورہ جدول کو کو مد نظر رکھا جائے۔

۱۳. مقالہ کی Soft copy بذریعہ e-mail یا CD میں اور Hard copy میں بھی مہیا کیا جائے۔

۱۴. مقالے کا عنوان جدید نوعیت کا ہو جس کے نتائج سے معاشرہ مستفید ہو سکے۔

۱۵. مقالہ ریسرچ کے جملہ اہداف کو پورا کرتا ہوا نظر آئے۔

۱۶. دوسری زبانوں (عربی اور انگلش) کی غیر مروجہ اصطلاحات بریکٹ کی صورت میں دی جائیں۔

۱۷. صفحہ کا مارجن دائیں "0.75" بائیں "0.75" اُوپر "1" نیچے "0.75" ہو۔

۱۸. ادارہ ہر مقالہ نگار کو شائع شدہ مجلہ کی ایک اعزازی کاپی فراہم کرے گا۔

۱۹. العرفان میں چھپنے کے لئے بھیجے گئے مقالہ کی Evaluation اور Plagiarism Report کے مراحل میں اگر کوئی تبدیلی ضروری ہوئی تو مقالہ نگار مذکورہ بالا دونوں رپورٹس کے مطابق مقالے میں اصلاح کے لئے زحمت دی جائے گی۔

کتابتِ مقالہ کے دوران آیاتِ قرآنیہ کو پھول دار بریکٹس ﴿﴾ اور اَحادیث و اَقوال کو (Inverted Commas) میں اندراج کیا جائے گا، نیز مقالہ کے دوران حوالہ جات کے اندراج کے لیے درج ذیل اسالیب کو اپنایا جائے گا:

قرآن کا حوالہ: سورۃ بقرۃ، ۲/۵۶

حدیث کا حوالہ: بخاری، محمد بن اسماعیل، (۱۴۰۸ھ)، الصحیح، دار الفکر العربی، بیروت، لبنان۔ ج ۱، ص ۳۴، رقم: ۱۰۹

کتاب کا حوالہ: یزدانی، ڈاکٹر خواجہ حمید، (۲۰۰۴ء)، شرح اسرار و رموز، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان۔ ص ۴۵

مجلہ کا حوالہ: اوج، ڈاکٹر محمد شکیل، "نکاح و طلاق میں زوجین کے حقوق کا تعین"، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، (انڈیا)، دسمبر، ۲۰۱۰ء، ص: ۴۳۲

آن لائن دستاویز کا حوالہ: https://dorar.net/article/1716

عصرِ حاضر کا اَخلاقی اِنحطاط

نوعیت، اسباب اور اثرات کا تحقیقی جائزہ

Contemporary moral decay
(Research review of nature, causes and effects)

☆ شفاقت علی شیخ
☆☆ ڈاکٹر فیض اللہ بغدادی
☆☆☆ سید فیض الحسن ہمدانی

ABSTRACT

Today's world is in the throes of a global crisis that has engulfed every aspect of life. A closer look at its depths reveals that there is only one root and that is moral decay. All economic, political and social problems are arising from it. There are only two major areas of moral decay.1. Selfishness. 2. Materialism. The causes of moral decay are ignorance, luxury, lack of social justice and pollution of the environment. The effects of this decline on life include loss of peace of mind, weakness of emotions, increase in mental illness, increase in drug use, increase in social crime and suicide etc. Ashraf has fallen far below the place of creation and has turned human society into a jungle of animal mountains.

انسانیت کی مجموعی تاریخ میں بالعموم اور گزشتہ دوصدیوں میں بالخصوص انسان نے مختلف علوم و فنون اور زندگی کے تمام شعبوں مثلاً سیاست، معیشت، تمدن ، معاشرت، صحت اور تعلیم وغیرہ میں جو ترقی کی ہے اور جدید ایجادات و اکتشافات نے زندگی کے دامن کو جن سہولتوں ، لذتوں ، راحتوں اور آسائشوں سے بھر دیا ہے اُس کا لازمی نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ آج کا انسان پہلے کی نسبت زیادہ مطمئن و مسرور ہوتا اور اجتماعی زندگی کے مسائل کا کوئی ایسا حل دریافت کر چکا ہوتا جس کے ذریعے دنیا سے بدامنی اور فتنہ و فساد کا خاتمہ ہو جاتا اور معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن

☆ پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، لاہور یونیورسٹی، لاہور
☆☆ سینئر ریسرچ اسکالر، فریدِ ملت ریسرچ انسٹیٹیوٹ، لاہور
☆☆☆ ایم۔فل اسلامک سٹڈیز، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد

جاتا۔ لیکن عملی طور پر صورتِ حال اس کے برعکس دکھائی دے رہی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تمام تر معراج کے باوجود زندگی کی زلف پریشان ہے اور اسے سنوارے کی جتنی کوششیں ہو رہی ہیں اُتنی ہی یہ اُلجھتی چلی جا رہی ہے مسائل کو حل کرنے کے جتنے جتن ہو رہے ہیں اُتنا ہی یہ بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ تمام تر مادی لوازمات کی فراہمی کے باوجود آج کا انسان پریشان ہے۔ اُس کے دل و دماغ میں بے چینی اور اضطراب ہے۔ وہ ذہنی و قلبی سکون و اطمینان سے محروم ہے اور اُس کی روح ویران ہے۔ وقتی، عارضی اور سطحی خوشیوں میں انہماک نے انسان کو حقیقی، دائمی اور پائیدار خوشیوں سے محروم کر دیا ہے۔ یہ حال تو انفرادی سطح پر ہے۔ اجتماعی سطح پر دیکھا جائے تو پورا معاشرہ بدامنی و بدنظمی، لاقانونیت و عدمِ مساوات، فتنہ و فساد، ظلم و زیادتی، قتل و غارت گری، تشدد و محاذ آرائی، سنگدلی و بے حسی اور مختلف اقسام کے تعصبات کا شکار ہو کر جہنم کا منظر پیش کر رہا ہے انسانیت سِسک رہی ہے اور دنیا بڑی تیزی سے تباہی و بربادی کی سمت جا رہی ہے۔ ہر حساس اور دردِ دل رکھنے والا شخص پستی کے اس سفر کو دیکھ رہا ہے مگر کچھ کرنے سے قاصر ہے اور بے بس تماشائی بنا ہوا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آج کی دنیا ایک ہمہ گیر بحران کا شکار ہے جو زندگی کے تمام گوشوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ تمام تر کوششوں کے باوجود ابھی تک اس پر قابو نہ پاسکنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ معاملے کی اصل نوعیت کو سمجھا نہیں جا سکا۔ دنیا کا نظام علت اور معلول (Cause & Effect) کے اُصول پر چل رہا ہے کسی بھی مسلے کو حل کرنے کے لیے اُس کے اصل سبب کو جان کر اُسے ختم کرنا ضروری ہے۔ درخت کے وجود کو مٹانا ہو تو جڑ کو کاٹنا ہو گا محض شاخوں اور پتوں کے کاٹ دینے سے مقصد حاصل نہیں ہو گا اسی طرح کسی مسلے کو حل کرنا ہے تو پہلے اُس کی اصل وجہ معلوم کرنی ہو گی اور اُس کی اصلاح کرنا ہو گی۔ ورنہ مسلہ کبھی حل نہیں ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں پایا جانے والا بگاڑ دراصل معاشرے میں پائے جانے والے اخلاقی انحطاط کا براہِ راست یا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ تمام مسائل اسی بنیادی مسلہ کی شاخیں اور اسی مجموعی کلیت کے فروع ہیں۔ اس لیے انہیں حل کرنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ ہم زندگی کے بنیادی مسلہ یعنی اخلاقی اقدار کے مسلہ کو لیں اور پھر معاشی، سیاسی اور تمدنی مسائل پر اس حیثیت سے نظر ڈالیں کہ یہ سب اسی اصل کی شاخیں اور اسی کل کے اجزاء ہیں۔ اگر آج تک کی تمام تدبیریں مسائل کو حل نہیں کر سکیں تو اس کا واحد سبب ہی یہ ہے کہ انسان کے اصل مسلہ کو جس کا تعلق اُس کے اخلاق اور کردار سے ہے نظر انداز کر کے شجرِ تمدن کی شاخوں اور پتوں کو الگ الگ بنانے اور سنوارنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حالانکہ شاخوں اور پتوں کے خواص و کیفیات جڑ سے پیدا ہوتی ہیں اور جڑ کی مضبوطی اور درستگی سے ہی ان میں خوبی و زیبائش اور حسن و رعنائی وجود میں آتی ہے۔

انسان کا اخلاقی کردار ہی وہ واحد سرچشمہ ہے جس سے اس کے ، معاشی، سیاسی اور تمدنی اعمال کے چھوٹے چھوٹے چشمے جاری ہوتے ہیں۔ درحقیقت جن مسائل کو خالصۃً تمدن، معیشت اور سیاست کے دائروں سے متعلق سمجھا جاتا ہے وہ اسی ایک مبنٰا اور منبع یعنی انسان کے اخلاقی اور روحانی نقطہ نظر سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اخلاقی زندگی کی خرابیوں پر موقوف اور مبنی ہوتی ہیں اس لیے جب تک انسانی اخلاق کی بنیاد صحیح نہ ہو، انسان کا روحانی نقطہ نظر درست نہ ہو اور اُس کا ذہن بہتر اخلاقی اقدار و نظریات کا حامل نہ ہو اُس کے سیاسی، معاشی اور تمدنی اعمال میں زندگی کی لطافت اور حسن و جمال کی رعنائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اور دوسرے مذہبی صحائف نے براہِ راست معاشی یا تمدنی اعمال سے بحث کرنے کی بجائے انہیں ضمنی اور فروعی حیثیت دی ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں سوسائٹی کے وقتی مسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہاں یہ ظاہر کر دیا گیا ہے۔ کہ ان کے متعلق جو قوانین وضع کئے جارہے ہیں اُن کے فائدہ اور نقصان کا دارومدار تمام تر انسان کے اخلاقی نقطۂ نظر اور روحانی نصب العین پر ہے۔ چنانچہ جہاں بھی باہمی معاملات کے تعین کے حوالے سے ھدایات دی گئی ہیں وہاں ایمان، تقوٰی، توکل، عدل اور احسان وغیرہ جیسے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً قرآن جہاں گواہی قلمبند کرنے کا طریقہ بتاتا ہے وہاں بھی یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ اس خالص دنیوی معاملہ کی اصلاح و درستگی بھی، جس کا بظاہر مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، تقوٰی اور خشیّتِ الہیٰ پر موقوف ہے :

﴿وَاَشْهِدُوا اِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّه فُسُوْقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (۱)

"اور جب آپس میں سودا کرو تو گواہ بنالو، اور لکھنے والے اور گواہ بنانے والے کو تکلیف نہ دی جائے، اور اگر تم نے تکلیف دی تو تمہیں گناہ ہو گا، اور اللہ سے ڈرو، اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے، اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے"

اسی طرح جہاں قرآن مالِ غنیمت کی تقسیم کے متعلق ہدایات دیتا ہے جو کہ ایک خالص فوجی اور معاشی مسلہ ہے وہاں اس کے ساتھ اللہ پر ایمان لانے کی تاکید کرتا ہے:

﴿وَاعْلَمُوا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَىْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَه وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (۲)

---

(۱)البقرہ۲:۲۸۲

"اور جان لو کہ جو کچھ تمہیں بطور غنیمت ملے خواہ کوئی چیز ہو تو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، اگر تمہیں اللہ پر یقین ہے اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن اتاری جس دن دونوں جماعتیں ملیں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"

پھر جب وہ کفار سے صلح و جنگ کے قاعدے بتاتا ہے تو بھی اللہ پر توکل کی تعلیم دیتا ہے :

﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّه هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ (۳)

"اور اگر وہ صلح کے لیے مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو، بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے"

اس سے قرآن کا نقطۂ نظر ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس کے نزدیک اگر انسان کا رشتہ خدا کے ساتھ مضبوط نہیں ہے، اگر وہ مکافاتِ عمل کے قانون اور کائنات میں ایک عمومی اور شعوری مشیّت کی حکمرانی پر ایمان نہیں رکھتا ہے اور اُس کے مصالح کے ساتھ اشتراکِ عمل کا جذبہ اُس میں پیدا نہیں ہوا ہے تو وہ معاشرتی احکام پر اُن کی اصل روح کے ساتھ عمل پیرا نہیں ہو سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے تین چوتھائی حصہ سے زیادہ میں خدا کی ذات و صفات، اُس کے قوانینِ مشیّت، اعمال کی جزا و سزا اور آخرت کے اعتقاد سے بحث کی گئی ہے اور صرف ایک چوتھائی حصہ میں معاشی سیاسی اور تمدنی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ قرآن مجید کے نزدیک زندگی کا بنیادی اور اصل مسلہ معاشرتی مسائل نہیں۔ بلکہ اخلاقیات ہے۔

اخلاقی انحطاط کی نوعیت

عصرِ حاضر میں اخلاقی انحطاط جو زندگی کے ہر شعبے میں کینسر کی طرح سرایت کیے ہوئے ہے اور جس نے وجودِ انسانیت کو کھوکھلا کر دیا ہے اس کے ذیلی اور ضمنی شعبے تو بے شمار ہیں لیکن بڑے دائرے میں اُسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

---

(۲) الانفال ۸:۴۱

(۳) الانفال ۸:۶۱

ا۔ نفس پرستی

جب نفسِ انسانی میں موجود خیر کی قوتوں پر شر کی قوتیں غالب آجاتی ہیں تو انسان پر جذبات و خیالات کی جو دنیا غالب رہتی ہے وہ منفی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اُس میں انتقام، غیض وغضب، دوسروں کی تذلیل و تحقیر، اپنی بڑائی کے احساسات، حُبِّ مال اور مادی دنیا پر فریفتگی غالب ہوتی ہے۔یہی وہ طاقتور خیالات و جذبات ہوتے ہیں جو معاشرہ میں دولت جمع کرنے کے جنونی مظاہر، قتل و غارت، فتنہ و فساد، غربت کے مناظر، بے قید جنسی خواہشات، قومی وسائل کی بڑے پیمانے پر لوٹ مار، رشوت و اقربا پروری اور سماجی انصاف کے فقدان وغیرہ کی صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ نفس کی منہ زور خواہشات کی ان قہر سامانیوں کی وجہ سے ہر قوم کا ریاستی نظام اس بات پر مجبور ہوتا ہے۔ کہ وہ افراد کے فاسد جذبات و خیالات کو حدِّ اعتدال میں رکھے تاکہ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ اور خلفشار سے محفوظ رہ سکے۔ اس سلسلہ میں قوانین وضع کیے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ اخلاقی تربیت کا نظام تشکیل دیا جاتا ہے۔ تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ انسان نے وحی اور مذہبی تعلیمات سے ہٹ کر اب تک اخلاقی تربیت کا جو نظام بھی تشکیل دیا ہے وہ افراد کے جذبات و خیالات کی تہذیب میں ناکام رہا ہے۔ البتہ تہذیب نفس کے بغیر کس حد تک مصنوعی طور پر قومی اخلاق کی صورت ضرور پیدا ہوتی ہے۔ جس کی جھلک مغربی اقوام کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔

مغربی قوموں نے اپنے اخلاقی بحران کو عقلیت کے ذریعہ قانونی حکومت اور قومی اخلاق کے نام سے پُر کرنے کی کوشش کی ہے اور عام لوگوں کو نظام تعلیم کے ذریعے قومی اخلاق کی تربیت دے کر، اُنہیں معاشرہ کے لیے ایک حد تک بہتر اور مفید بنانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اُن کے ہاں روحانی تسکین کا انتظام نہ ہونے کے باوجود انتظامی و عدالتی سطح پر انصاف موجود ہے اور ایک خودکار نظام ہے جس کے تحت لوگوں کی روزمرہ زندگی کے سارے کام آسانی سے ہو جاتے ہیں اور اُنہیں رشوت اور دوسری پریشانیوں سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ تاہم یہ صرف سطح کے اوپر دکھائی دینے والا منظر ہے۔ اس محدود دائرے کو چھوڑ کر پس منظر میں جھانک کر دیکھا جائے تو اُن کے ہاں بھی وہ خرابیاں اور بُرائیاں دکھائی دیتی ہیں جو نفس پرستی کے حامل افراد کے معاشرے میں ہو سکتی ہیں۔ بہر حال وہاں ایک ظاہری بھرم قائم ہے جب کہ ہمارے یہاں نہ تو قومی اخلاق کے نام سے کوئی نظام موجود ہے اور نہ ہی اسلام کے سنہری اُصولوں کی روشنی میں تہذیبِ نفس کا کوئی موثر نظام ہے جس کے تحت تعلیم و تربیت کے ذریعے نفس کو اخلاقِ حسنہ سے آراستہ و پیراستہ کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ اُوپر سے لے کر نیچے تک پورے معاشرے میں ایک انتشار اور افراتفری کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ اور انفرادی و اجتماعی زندگی حرص، لالچ، طمع، خود غرضی و بے حسی جیسے امراض کا شکار ہو کر حقیقی سکون و اطمینان سے محروم ہو چکی ہے۔

انسانی زندگی میں نفسی قوتوں کا عمل دخل اس حد تک فیصلہ کن اور موثر ہوتا ہے کہ یہ قوتیں ہر وقت یا تو عمل میں مصروف ہوتی ہیں یا عمل کے لیے فکر کر رہی ہوتی ہیں۔ ان کی ساخت ہی اس انداز کی ہے کہ یہ ایک لمحہ کے لیے بھی عمل سے غافل نہیں ہوتیں۔ ہر انسان کا نفس بے پناہ جذبات، خواہشات اور اُمنگوں کا مرکز ہوتا ہے۔ جذبات اور خواہشات کا نہ ختم ہونے والا طوفان ہر انسان کے اندر ہر وقت موجزن رہتا ہے۔ چنانچہ فرد کا ہر عمل انہی کے زیرِ اثر ہوتا ہے کوئی عمل ایسا نہیں جو نفس کی ان قوتوں کے عمل دخل سے باہر ہو۔ دوست و احباب اور عزیز و اقارب کے ساتھ تعلقات اور زندگی کے تمام چھوٹے بڑے معاملات انہی کے زیر اثر تکمیل پزیر ہوتے ہیں۔ ان قوتوں کی شہ زوری کا اندازہ یہاں سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی نفوس کے تزکیہ اور تہذیب کے لیے پے در پے انبیاء کرام بھیجے۔ نبوت کا باب بند ہونے کے بعد بھی ہر زمانے میں اولیائے کرام اور علمائے ربانی کا سلسلہ جاری رہا جو لوگوں کو نفس کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی کی طرف لانے کی جدوجہد کرتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود آج بھی انسانوں کی اکثریت نفس پرستی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور یہ صورتِ حال تاریخِ انسانی کے ہر دور میں کم و بیش اسی طرح دکھائی دیتی ہے۔

نفس پرستی کے غلبہ کی حالت میں افرادِ معاشرہ سے جو کردار ظاہر ہوتا ہے اُس کی اگر نشاندہی کی جائے تو اس طرح کی جاسکتی ہے: قیمتی زندگی کا دولت، اقتدار اور لیڈرشپ کے حصول کے جھگڑوں میں صرف ہونا، نفسا نفسی اور ذاتی مفادات کی فضا کا غالب آنا، ساری توانائیوں کا مادی زندگی کو خوبصورت بنانے کے لیے صرف ہونا، ریاست کے بیشتر وسائل کا ایک خاص طبقہ کے لیے مخصوص ہونا، صاحبانِ اقتدار کی طرف سے محض حبِّ جاہ و مال کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے زندگی کو دشوار تر بنانا، قومی خدمت کے کاموں میں اپنے مفادات ہی کو پیشِ نظر رکھنا، فحاشی و عریانی اور بے حیائی کا عام ہونا، افرادِ معاشرہ کا حسد، بغض، کینہ نفرت، انتقام اور غیض و غضب کے جذبات سے مغلوب ہونا، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کا ختم ہونا، امانت میں خیانت اور روزمرہ کے معاملات میں بدیانتی کا کلچر عام ہونا وغیرہ۔ غرض اس طرح کے سینکڑوں مظاہر اور علامتیں ہیں جو نفس پرستی کی داخلی قوتوں کے غلبہ کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہیں۔

تہذیبِ نفس اور تزکیہ نفس کا کام ایسا ہے جس سے دین و دنیا کی ساری بھلائیاں وابستہ ہیں۔ اس کام سے افراد، معاشرے اور ریاست کے اتنے مصالح وابستہ ہیں کہ یہ کہنا بالکل بجا ہو گا کہ انسانی معاشروں اور ریاستوں کی بہتری، ترقی اور استحکام کا دارومدار افراد کی تہذیبِ نفس پر ہی ہے۔ تہذیبِ نفس اور ضبطِ نفس کے بغیر مادی ترقی اُس سراب کی طرح ہے جو دور سے پانی نظر آئے۔ لیکن قریب جانے پر ریت کے ذرات ظاہر ہوں۔ یہ کہنا بھی بے جانہ ہو گا کہ کسی قوم اور معاشرے کی کامیابی و ناکامی اور عروج و زوال کا تمام تر انحصار اسی نکتے پر ہے۔ ماضی کی شاندار قوموں کی تباہی و زوال اس پر شاہد ہے اور الہامی کتابوں کا مطالعہ بھی اس کی گواہی کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ اصلاحِ نفس اور تہذیب نفس

کا کام ایسا ہے جو فرد کی اپنی ضرورت بھی ہے اور معاشرے و ریاست کی بھی۔ اصلاحِ نفس سے بے نیازی کا نتیجہ نہ صرف فرد کو خود اعتمادی کے بحران، نفسیاتی بیماریوں اور اضطراب کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے بلکہ اس سے معاشرے اور ریاست کے استحکام کو بھی خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ تہذیب نفس سے محروم حکمران و افسران، تاجران و صنعتکاران نفس کی شہ زوری کی وجہ سے ملک میں ایسی لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں کہ عام لوگوں کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے اور سارے قوانین اُن کی نفسانیت اور سرکشی کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ کلچر اُوپر سے چلتا ہوا نیچے آتا ہے اور پوری قوم کا مزاج بن جاتا ہے اور کینسر کی طرح جسد ملی کے ہر حصے میں سرایت کرتا ہوا اُسے ناکارہ بنا دیتا ہے۔

۲- مادیت پرستی

اخلاقی انحطاط کی دوسری بڑی شاخ (Branch) مادیت پرستی ہے۔ اس کا مطلب ہے دنیا اور اُس کے سازو سامان کے حصول کو زندگی کا واحد مقصد بنا لینا، دنیا کی ظاہری چمک دمک اور زیب و زینت سے بہت زیادہ متاثر ہونا، لوازماتِ حیات کو زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کی فکر میں رہنا۔ لذت و راحت، آرائش و زیبائش اور نمود و نمائش کے سامانوں کا بہت زیادہ حریص ہونا۔ دنیا کی سطحی، عارضی، فانی اور ناپائیدار چیزوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہوئے دل و دماغ پر سوار کر لینا اور تمام تر توانائیوں، صلاحیتوں اور فکری و عملی قوتوں کو اُن کے حصول میں لگا دینا۔ الغرض دنیا کی حقیقت، اصلیت اور انجام کو فراموش کرتے ہوئے اس کی ظاہری دلکشی میں غرق ہو جانے کو مادیت پرستی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تہذیت مغرب نے الحاد اور تصورِ آخرت کے انکار پر جو عمارت کھڑی کی اُس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ جب دنیا ہی سب کچھ ہے تو پھر اسے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہئے اس مقصد کے لیے جائز اور ناجائز کی تمیز کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی کسی اخلاقی ضابطے کی پیروی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آج مغربی تہذیب کا مرکزی نکتہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لذت و راحت کو حاصل کرنا ہے تمام ایجادات و اکتشافات میں یہی فلسفہ کار فرما ہے خوشی نصیبی و بدنصیبی اور کامیابی و ناکامی کا معیار بھی یہی ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ دنیوی سازو سامان کو حاصل کر لیتا ہے اور دنیا کی رنگینیوں اور رونقوں کو جس قدر اپنے گرد جمع کر لیتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ کامیاب و کامران سمجھا جاتا ہے اور جو جتنا ان چیزوں سے محروم ہو وہ اُسی قدر ناکام و نامراد تصور کیا جاتا ہے۔

عصر حاضر مغربی تہذیب کے غلبے کا دور ہے اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جو تہذیب غالب ہو وہ سکۂ رائج الوقت ہوا کرتی ہے اور دنیا کی دیگر تہذیبیں شعوری یا لاشعوری طور پر اُس سے متاثر ہوا کرتی ہیں۔ یہی کچھ آج اُمتِ مسلمہ کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ آج کا مسلم ذہن اس تہذیب کی چکاچوند سے بہت زیادہ مرعوب ہے۔ اس کی حیران کن مادی کامیابیوں نے اُس کی نگاہوں کو خیرہ کر رکھا ہے۔ وہ اس کی برتری کو ذہنی طور پر تسلیم کر چکا ہے اور اس کے انجام

سے قطع نظر اس کے وقتی عروج کو کامیابی کا پیمانہ سمجھتے ہوئے اُس کے دیے ہوئے معیارات کی رو میں بہے چلا جارہا ہے۔اور چونکہ اُس تہذیب کی بنیاد ہی مادیت پرستی پر رکھی گئی ہے چنانچہ مادیت پرستی کا یہ سیلاب بڑی تیزی کے ساتھ مسلم معاشرہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے اور کم و بیش ہر خاص و عام اُس کے اثرات کا شکار ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں اخلاقی اقدار بڑی تیزی کے ساتھ زوال پزیر ہو رہی ہیں۔ یہ تاریخ کا مسلّمہ اُصول اور قدرت کا اٹل قانون ہے کہ جو معاشرہ اعلیٰ حقائق اور معنوی لذتوں کو چھوڑ کر محض وقتی لذتوں اور عیش و عشرت کو ہی زندگی کا مقصود بنالے اُسے اخلاقی اعتبار سے تباہ و برباد ہونے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔

مادیت پرستی کا یہ رجحان اتنا زیادہ عام ہو رہا ہے کہ اس معاملے میں مغرب اور مشرق کا فرق مٹتا چلا جارہا ہے۔ آخرت کا انکار کرنے والوں اور آخرت کا اقرار کرنے والوں کے جینے کی سطح تقریباً ایک ہی دکھائی دے رہی ہے۔ حالانکہ اس میں بہت زیادہ فرق ہونا چاہیئے تھا۔بقول اقبالؒ:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہے آفاق (۴)

کہاں وہ فلسفہ زندگی جس کے مطابق نہ اس دنیا کا کوئی خالق و مالک ہے اور نہ اس کا کوئی بامعنی انجام ہے۔ بس جو کچھ سامنے دکھائی دے رہا ہے یہی سب کچھ ہے لہٰذا اس سے جتنا زیادہ متمتع ہو سکتے ہوں، ہونا چاہئے اور کہاں وہ فلسفہ زندگی جس کے مطابق اس دنیا کا ایک خالق ہے جس نے اپنی حکمت کاملہ کے ساتھ اس دنیا کو بامعنی انداز میں مصلحتِ امتحان کے تحت تخلیق کیا ہے۔ دنیا میں انسان ہر وقت حالتِ امتحان میں ہے۔ موت نے آکر اس مہلتِ امتحان کو ختم کر دینا ہے۔اور پھر اللہ کی بارگاہ میں پیش ہو کر ہر انسان نے اپنی زندگی بھر کے چھوٹے بڑے اعمال کا حساب دینا ہے۔ پھر اچھے اعمال والے کے لیے ابدی راحت ہے جب کہ بُرے اعمال کے مرتکب کے لیے ہمیشہ کی ذلت اور عذاب ہے۔ ان دو نظریہ ہائے حیات کے ماننے والوں کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں جو لازمی فرق دکھائی دینا چاہئے وہ آج مفقود ہو چکا ہے۔

سوال یہ کہ ایمان والے اتنی پست سطح پر کیوں آگئے؟ مختصر جواب ہے: ایمان کی کمزوری، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کی حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، اپنا مقام و مرتبہ یاد نہ رہا، آخرت کا ثواب و عذاب بہت دور دکھائی دینے لگا اور اللہ کے سمیع و بصیر ہونے کا استحضار نہ رہا۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کو حُبِّ عاجلہ سے روک سکتی ہیں اور دنیا میں غرق ہونے سے بچا سکتی ہیں اب جب زندگی میں کوئی اعلیٰ نصب العین ہی نہ ہو تو پھر دنیا کی سامنے دکھائی دینے والی نقد رونقوں

(۴)ضربِ کلیم، ص۵۷/۵۵۷

سے دامنِ دل کو کیسے بچایا جا سکتا ہے، جب کہ اندر سے نفس کے تقاضے بھی پوری شدت کے ساتھ انہی چیزوں کی طرف کھینچ رہے ہوں۔ ایمان اور کفر کے درمیان فرق تو ایمان کا ہی ہے جب ایمان ہی کمزور ہو جائے تو پھر کافرانہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے کون سی چیز انسان کو روک سکتی ہے ؟ قرآن و حدیث میں جابجا لوگوں کو دنیوی زندگی کی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے مختلف اسالیب اور تماثیل سے کام لیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۵)

"اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے، اور اصل زندگی عالم آخرت کی ہے کاش وہ سمجھتے"

یہاں دنیوی زندگی کو کھیل تماشہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ جس طرح کھیل تماشہ بہت جلد ختم ہو جانے والی چیز ہے، یہی حال دنیا کا ہے۔ لمحہ لمحہ کر کے صدیاں بیت جاتی ہیں اور جب وقت گزر جاتا ہے تو سو سال کی زندگی بھی کل کی بات دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں بتایا گیا ہے کہ قیامت والے دن لوگوں کو یوں محسوس ہو گا کہ وہ دنیا میں ایک دن سے بھی کم عرصہ رہے ہیں:

﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ﴾ (۶)

"اور جس دن قیامت قائم ہو گی گناہگار قسمیں کھائیں گے کہ ہم ایک گھڑی سے بھی زیادہ نہیں ٹھہرے تھے"

﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحَاهَا﴾ (۷)

"جس دن اسے دیکھ لیں گے (تو یہی سمجھیں گے کہ دنیا میں) گویا ہم ایک شام یا اس کی صبح تک ٹھہرے تھے"

دوسری بات یہ ہے کہ کھیل تماشے میں حقیقت نہیں ہوتی بلکہ مجاز ہوتا ہے۔ اسی طرح دنیا کے ساز و سامان کی ظاہری خوبصورتی اور زیب و زینت اس کی اصلیت کو چھپا لیتی ہے اور اس میں پوشیدہ فتنوں کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتی ہے:

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (۸)

---

(۵) العنکبوت ۲۹ : ۶۴

(۶) الروم ۳۰:۵۵

(۷) النازعات ۷۹:۴۶

"اور دنیا کی زندگی سوائے دھوکے کی پونجی کے اور کچھ نہیں"

انسان اس کے ظاہری حسن کو دیکھ کر ضرورت سے بہت زیادہ اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اس کے انجام کو فراموش کرتے ہوئے اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے کقولہ تعالیٰ:

﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ﴾ (۹)

"دنیا کی زندگی کی ظاہر باتیں جانتے ہیں اور وہ آخرت سے غافل ہی ہیں"

دوسری جگہ دنیوی زندگی کو پانی سے تشبیہ دی گئی ہے:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيَاحُ﴾ (۱۰)

"اور ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کرو جو مثل ایک پانی کے ہے جسے ہم نے آسمان سے برسایا پھر زمین کی روئیدگی پانی کے ساتھ مل گئی پھر وہ ریزہ ریزہ ہو گئی کہ اسے ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں "

پانی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک جگہ نہیں ٹھہرتا دوسری یہ ہے کہ جو آدمی اس میں داخل ہو وہ تر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور تیسری یہ ہے کہ جب تک ضرورت کے مطابق ہو فائدہ مند ہوتا ہے۔ لیکن زیادتی بجائے فائدہ کے نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ یہی تمام خصائص دنیا کے بھی ہیں۔ یہ بھی ایک جگہ نہیں ٹھہرتی آج اسبابِ دنیا ایک کے پاس ہوتے ہیں تو کل دوسرے کے پاس۔ جو آدمی دنیا کی محبت میں غرق ہو وہ گناہوں سے آلودہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کقولہ علیہ السلام:

(حب الدنيا رأس كل خطيئة) (۱۱)

---

(۸) آل عمران ۳: ۱۸۵

(۹) الروم ۳۰:۷

(۱۰) الکہف ۱۸:۴۵

(۱۱) هندی، علاء الدین علي المتقي بن حسام الدین، کنز العمال، دار الکتب العلمیة، بیروت، ۱۴۱۹ھ / ۱۹۹۸ء (الطبعة الأولی)، رقم: ۳، ۶۱۱۴ / ۷۹

جب تک ضرورت کے مطابق ہو تو نہایت مفید ہے لیکن جب انسان زیادہ سے زیادہ لوازماتِ دنیا کو اکھٹا کرنے کے جنون میں مبتلا ہو جاتا ہے تو تباہی و بربادی اُس کا مقدر بن جاتی ہے:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا﴾ (۱۲)

"کہہ دو کیا میں تمہیں بتاؤں جو اعمال کے لحاظ سے بالکل خسارے میں ہیں وہ جن کی ساری کوشش دنیا کی زندگی میں کھو گئی اور وہ خیال کرتے ہیں کہ بے شک وہ اچھے کام کر رہے ہیں"

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کی بقاء، ارتقاء اور نشوونما کے لیے وسائلِ حیات کا ہونا اشد ضروری ہے اور ان کے بغیر زندگی کی گاڑی ایک دن بھی نہیں چل سکتی قرآنِ مجید کے بقول دنیا کے تمام اسباب انسان کے لیے ہی بنائے گئے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (۱۳)

"اللہ وہ ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا ہے"

﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَه بِرَازِقِيْنَ﴾ (۱۴)

"اور اس میں تمہارے لیے روزی کے اسباب بنا دیے اور ان کے لیے بھی جنہیں تم روزی دینے والے نہیں ہو"

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید کہیں تو مال و دولت کو زندگی کے قیام اور بقا کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے اُس کی حفاظت کی تلقین کرتا ہے اور کہیں اُسے اللہ کا فضل قرار دیتے ہوئے اُس کے حصول کی تلقین کرتا ہے:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ (۱۵)

---

(۱۲)الکہف۱۸ : ۱۰۳ – ۱۰۴

(۱۳)البقرۃ۲ : ۲۹

(۱۴)الحجر ۱۵ : ۲۰

(۱۵)النساء۴ : ۵

"اور اپنے وہ مال بے سمجھوں کے حوالے نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، البتہ ان مالوں سے انہیں کھلاتے اور پہناتے رہو اور انہیں نصیحت کی بات کہتے رہو"

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (۱۶)

"پس جب نماز ادا ہو چکے تو زمین میں چلو پھرو اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ"

یہاں اللہ کے فضل سے مراد مال کمانا ہے جو کہ وسائل رزق اور لوازماتِ حیات کے حصول کا ذریعہ ہے۔ حضور علیہ السلام نے بھی مال و دولت کی اہمیت کو مختلف پیرائے میں بیان فرمایا ہے:

(اليد العليا خير من اليد السفلى)(۱۷)

"اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے"

(نعم المال الصالح مع الرجل الصالح)(۱۸)

"نیک آدمی کے پاس پاکیزہ مال بہترین چیز ہے"

(لا بأس بالغني لمن اتقى) (۱۹)

"پرہیز گار شخص کو مال نقصان نہیں دیتا"

دوسری طرف مال و دولت کی بہت زیادہ قلت کو بہت بڑا فتنہ قرار دیتے ہوئے فرمایا:

كاد الفقر أن يكون كفرا. (۲۰)

---

(۱۶)الجمعہ ۶۲: ۱۰

(۱۷)بخاری، الصحیح، رقم:۱۳۶۱، ۲/ ۵۱۸

(۱۸)ابن حبان، محمد بن حبان، صحیح ابن حبان، فیہ، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۳ء، رقم:۳۲۱۰، ۸/ ۶

(۱۹)مسند احمد، رقم:۲۳۲۷۶، ۵/ ۳۸۰

"قریب ہے کہ محتاجی انسان کو کفر تک پہنچادے"

ایک طرف تو دنیا کی چیزیں انسان کی ضرورت ہیں جن کے بغیر گزارہ نہیں ہے دوسری طرف ان کی طرف ایک میلان اور کشش انسان کی طبیعت میں رکھ دی گئی ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَه حُسْنُ الْمَآبِ﴾ (۲۱)

"لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے فریفتہ کیا ہوا ہے جیسے عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان کیے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی، یہ دنیا کی زندگی کا فائدہ ہے اور اللہ ہی کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے"

یہاں لوازماتِ حیات میں سے چند نمایاں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اُنہیں انسانی نگاہ میں مزّین کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طبائع ان کی طرف کھچی چلی جاتی ہیں اور انسان جائز حدود پر اکتفا کرنے کی بجائے بہت آگے جانا چاہتا ہے۔ ان سب چیزوں کا ذکر کر کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ یہ دنیوی زندگی کا ہی سازو سامان ہے اور چونکہ دنیا خود فنا ہونے والی ہے لہٰذا یہ چیزیں بھی عارضی، فانی، ناپائیدار اور وقتی ہیں۔ لہٰذا ان میں غرق ہونے کی بجائے اپنی توجہ اور دھیان بعد میں آنے والی اُس ابدی زندگی کی طرف لگاؤ جہاں کی لذتیں اور راحتیں حقیقی، اصلی، پائدار اور ہمیشہ رہنے والی ہیں اسلام لذائذِ دنیا سے متمتع ہونے کی ممانعت نہیں کرتا ہے بلکہ اس سلسلے میں اُس کا کہنا ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِه وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾ (۲۲)

"کہہ دو اللہ کی زینت کو کس نے حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے واسطے پیدا کی ہے اور کس نے کھانے کی ستھری چیزیں (حرام کیں)، کہہ دو دنیا کی زندگی میں یہ نعمتیں اصل میں ایمان والوں کے لیے ہیں قیامت کے دن خالص انہیں کے لیے ہو جائیں گی، اسی طرح ہم آیتیں مفصل بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں"

---

(۲۰) کنز العمال، رقم:۱۶۶۸۲، ۶/ ۲۱۰

(۲۱) آل عمران ۳ : ۱۴

(۲۲) الاعراف ۷ : ۳۲

تاہم شرط یہ ہے کہ ایک تو یہ استعمال حدودِ شرع کے اندر رہتے ہوئے اسراف و تبذیر سے بچ کر ہونا چاہئے:

﴿يَا بَنِي اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّه لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (۲۳)

"اے آدم کی اولاد تم مسجد کی حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو اور کھاؤ اور پیئو اور حد سے نہ نکلو، بے شک اللہ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا"

﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّه وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا﴾ (۲۴)

"اور رشتہ دار اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دے دو اور مال کو بے جا خرچ نہ کرو"

اور دوسرا یہ کہ ان میں اتنا انہماک نہ ہو کہ انسان اپنے خالق و مالک کو بھول جائے اور اُخروی انجام سے بے پرواہ ہو جائے:

﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ﴾ (۲۵)

"اے ایمان والو! تمہیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں، اور جو کوئی ایسا کرے گا سو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں"

چنانچہ قرآن و حدیث میں جہاں بھی دنیا اور اُس کے سازو سامان کی مذمت کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی قابلِ نفرت اور ترک کر دینے والی چیز ہے۔ اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے حضور علیہ السلام نے فرمایا:

(لا رهبانية في الإسلام) (۲۶)

---

(۲۳) الاعراف ۷:۳۱

(۲۴) الاسراء ۱۷:۲۶

(۲۵) المنٰفقون ۶۳:۹

(۲۶) عسقلانی، أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل، فتح الباري شرح صحيح البخاري، دار المعرفة، بیروت، ۹/۱۰۱

"اسلام میں رہبانیت نہیں ہے"

اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیا کے اندر رہتے ہوئے اور اس کے لوازمات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کو نہیں بھولنا ہے:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلَاةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكَاةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ﴾ (۲۷)

"ایسے آدمی جنہیں سوداگری اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر اور نماز کے پڑھنے اور زکوٰۃ کے دینے سے غافل نہیں کرتی، اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی"

دنیا قابلِ مذمت بنتی ہی اُس وقت ہے جب یہ خدا اور بندے کے درمیان حائل ہو جاتی ہے اور انسان کو اللہ کی یاد اور اطاعت سے ہٹا دیتی ہے مولانا رومؒ نے اس نکتے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ مثنوی کے ایک شعر میں یوں بیان کیا۔

چیست دنیا؟ از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن (۲۸)

یہاں پہلے مصرعے میں سوال کیا گیا کہ جس دنیا کی قرآن و حدیث میں مذمت کی گئی ہے وہ ہے کیا؟ جواب دیا کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ سے غافل کر دے۔ دوسرے مصرعے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا کہ سونا چاندی، مال و دولت اور بیوی بچوں میں سے کوئی بھی چیز بذاتِ خود دنیا نہیں ہے کہ اُسے قابلِ نفرت سمجھتے ہوئے ترک کر دیا جائے۔

تاریخ کے ہر دور میں بالعموم دنیا اور اس کے سازو سامان کے متعلق دو زاویہ ہائے نگاہ رہے ہیں لوگوں کے ایک گروہ (جو کہ بہت اقلیت میں ہے) کا خیال یہ بنا کہ دنیا اور اُس کی رونقیں ہی تمام مصائب کا سبب ہیں یہی انسان اور خدا کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ ہیں لہٰذا ان کو چھوڑ ہی دیا جائے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ چنانچہ یہ لوگ دنیوی سازو سامان سے کنارہ کشی کرتے ہوئے رہبانیت کی طرف چلے گئے جس کی اسلام میں ممانعت کی گئی ہے دوسرا گروہ (جو بہت بڑی اکثریت میں ہے) دنیا کی زیب و زینت اور چمک دمک سے اس قدر مرعوب ہوا کہ وہ اسی کو

---

(۲۷) النور ۲۴:۳۷

(۲۸) نقشبندی، ذوالفقار احمد، پیر، خطبات فقیر، مکتبۃ الفقیر، فیصل آباد، ۲۰۰۶ء، ۳/۱۵۷

مقصد زندگی سمجھ کر دیوانہ وار اس کی طرف لپک پڑا۔ اِسے پانے کے لیے ہر جائز و ناجائز تمام حدود کو پھلانگتا چلا گیا۔ یہ دونوں انتہائیں ہیں جو انسان کو سیدھی راہ سے ہٹا دیتی ہیں ان دونوں قسم کی غلط فہمی کا بنیادی سبب دنیا اور آخرت کے درمیان صحیح تعلق کو نہ سمجھ سکنا ہے جس کی بنا پر ایک طبقہ افراط کی طرف اور دوسرا تفریط کی طرف چلا گیا۔

اگر دنیا اور آخرت کے درمیان رشتے کی صحیح نوعیت کو سمجھ لیا جائے تو پھر انسان کے لیے گمراہی سے بچتے ہوئے صحیح نقطۂ نظر کو اپنانا آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس تعلق کو دو مثالوں کے ذریعے واضع کیا جاتا ہے۔

ا - پہلی مثال یہ ہے کہ دنیا امتحان گاہ ہے اور آخرت اس امتحان کے نتیجے کا اعلان ہے۔ جس طرح کی کارکردگی کا مظاہرہ کوئی شخص دورانِ امتحان کرے گا اُسی طرح کا نتیجہ وہ پالے گا۔ قرآن میں جابجا دنیوی زندگی کی اس حیثیت کو واضع کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ زندگی اور اس میں پیش آنے والے جملہ حالات بطورِ امتحان ہیں جن کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ کون شخص کس قسم کے طرزِ عمل کو اختیار کرتا ہے:

﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ﴾(۲۹)

"جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کس کے کام اچھے ہیں اور وہ غالب بخشنے والا ہے"

﴿وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَۃً وَاِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ﴾ (۳۰)

"اور ہم تمہیں برائی اور بھلائی سے آزمانے کے لیے جانچتے ہیں، اور ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے"

ایک اچھا طالب علم نہ تو امتحان سے فرار اختیار کرتا ہے اور نہ ہی وہ کمرہ امتحان میں موجود سہولتوں میں منہمک ہو کر وقت کو ضائع کرنے کا متحمل ہو سکتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی تمام تر توجہ اچھے نتائج کے حصول پر مرکوز کرتے ہوئے ملے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ بہترین انداز میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص جان لیتا ہے کہ اللہ نے اس دنیا کو میرے لیے ایک امتحان گاہ بنایا ہے۔ جہاں مجھے ایک خاص مدت تک کے لیے مہلت ملی ہوئی ہے۔ آخرت میں دل پسند اور خوشگوار زندگی کا تمام تر دارومدار اس زندگی میں کیے جانے والے اچھے اعمال پر ہے۔ وہ نہ تو زندگی سے

---

(۲۹)الملک ۶۷:۲

(۳۰)الانبیاء ۲۱:۳۵

راہِ فرار اختیار کرے گا اور نہ ہی دنیا کی زندگی میں منہمک ہو کر اعمالِ صالحہ سے غافل ہو گا۔ بلکہ اُس کی کوشش ہو گی کہ ہر لمحے میں بہترین عمل سرانجام دے کر اپنے خالق ومالک کی خوشنودی اور آخرت کی ابدی سعادت کو حاصل کرلے۔

۲ - اس سلسلے کی دوسری مثال وہ ہے جس میں حضور علیہ السلام نے دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیتے ہوئے فرمایا:

(إن الدنيا مزرعة الآخرة وفيها التجارة التي يظهر ربحها في الآخرة) (۳۱)

ہر شخص جانتا ہے کہ کھیتی باڑی میں بیج بونے اور پھر اُس کی نگہداشت کا وقت ہوتا ہے اور دوسرا وہ وقت ہوتا ہے جب فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے اوّل الذکر پیریڈ میں زیادہ تر محنت ومشقت ہوتی ہے اور راحت و آسانی کم ہوتی ہے لیکن جب انسان اس مشقت والے پیریڈ سے گزر جاتا ہے تو پھر اُس کے نتیجے میں آسانیاں اور راحتیں ملتی ہیں۔ یہی حال دنیاوآخرت کا ہے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دارالمحن اور آخرت کو دارالجزا بنایا ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے مصائب، شدائد اور تکالیف سے گزرنا ہوتا ہے۔ بقول قرآنِ مجید:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ﴾ (۳۲)

"بے شک ہم نے انسان کو مصیبت میں پیدا کیا ہے"

﴿يَآ اَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيْهِ﴾ (۳۳)

"اے انسان! تو اپنے رب کے پاس پہنچنے تک کام میں کوشش کر رہا ہے پھر اس سے جا ملے گا"

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ﴾ (۳۴)

---

(۳۱) عسقلانی، فتح الباري، کتاب الرقاق الصحۃ والفراغ ولا عیش الا عیش الآخرۃ رقم:۱۱،۶۰۴۹/ ۲۳۰

(۳۲) البلد ۹۰:۴

(۳۳) الانشقاق ۸۴ : ۶

(۳۴) البقرہ ۲ : ۱۵۵

"اور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے ضرور آزمائیں گے، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو"

جب انسان ہر قسم کے حالات میں ثابت قدمی اور استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو راست روی اور اعمالِ صالحہ پر قائم رکھتا ہے تو پھر اُس کا نتیجہ ابدی راحتوں کی صورت میں میسر آتا ہے۔ جس طرح کوئی عقلمند کسان نہ تو یہ گوارا کر سکتا ہے کہ وہ محنت و مشقت سے بچنے کے لیے کھیتی باڑی ہی ترک کر دے اور نہ ہی خراب یا غلط بیج ڈال کر پسندیدہ فصل سے محروم ہونا چاہتا ہے ایسے ہی ایک باشعور انسان عضوِ معطل بن کر بھی نہیں بیٹھ سکتا اور بُرے اعمال کا مرتکب ہو کر ہمیشہ کی ذلت و رسوائی کو بھی گوارہ نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک طرف وحی کے ذریعے دنیا کی حقیقت، اصلیت اور انجام ہمارے سامنے واضع فرمادیا ہے۔ دوسری طرف انسان کو عقل جیسی نعمت عطافرمائی ہے جس کی مدد سے غور و فکر کر کے وہ حقائق کی تہہ تک پہنچ کر اپنے لیے درست راستے کا انتخاب کر سکتا ہے۔ لیکن عقل کے ساتھ ایک مسلہ یہ ہے کہ بعض اوقات یہ جذبات کی خادمہ بن کر اُن کے لیے جواز تلاش کرنا شروع کر دیتی ہے۔ دنیا کی رونقیں انسان کی آنکھوں کے سامنے ہیں جب کہ آخرت کی نعمتیں نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ دنیا کے فوائد نقد ہیں جب کہ آخرت ادھار ہے۔ مذید بر آں انسان کی طبعیت اور مزاج میں بھی دنیوی لذتوں اور راحتوں کے لیے امتحان کی مصلحت کے تحت ایک خاص قسم کی کشش رکھ دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے نفع و نقصان کے حوالے سے انسان کے جذبات بہت شدید ہوتے ہیں۔ اب عقل اگر عقلِ سلیم ہو تو وہ وقتی جذبات سے اُوپر اُٹھ کر درست نتیجے پر پہنچتی ہے اور ہر چیز کو اُس کے مقام پر رکھتی ہے لیکن اگر عقل کی تربیت نہ ہوئی ہو تو وہ جذبات سے مغلوب اور متاثر ہو جاتی ہے اور اُن کی تکمیل کے لیے راستے ڈھونڈنا شروع کر دیتی ہے۔ اس بات کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ عقل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے عقلِ معاش اور دوسری عقلِ معاد عقلِ معاش وہ ہے جو صرف سامنے کے نفع و نقصان کو ہی دیکھتی ہے۔ چنانچہ وہ دنیوی زندگی کے سود و زیان کو ہی سب کچھ سمجھ کر اسی کو اپنی ترجیحِ اول بنالیتی ہے۔ قرآنِ مجید میں انسان کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (۳۵)

"تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو، اور اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے، اور اللہ غالب حکمت والا ہے"

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ (۳۶)

---

(۳۵)الانفال۸ : ٦٧

"بلکہ تم تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے"

جب کہ عقلِ معاد وہ ہے جو اس فرق کو سمجھ لیتی ہے اور آخرت کو اپنی ترجیح اوّل بنا لیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اُس کی توجہ فقط اس دنیا پر مرکوز نہیں رہتی بلکہ جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے دنیا کے فوائد و لذائذ کو استعمال میں لاتے ہوئے مقصود و مطلوب آخرت کو بنا لیتی ہے قرآنِ مجید میں سوچ کے ان دونوں زاویوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَه فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ اُولٰئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ (۳۷)

"پھر بعض تو یہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں دے، اور اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں نیکی اور آخرت میں بھی نیکی دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کی کمائی کا حصہ ملتا ہے، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے"

گویا کافریا کافرانہ سوچ کے حامل مسلمان کا منتہائے مقصود فقط دنیا کی چیزیں ہوتی ہیں لیکن ایک سچا مومن دنیا کی خیر اور بھلائی کو بھی حاصل کرنا چاہتا ہے مگر اُس کا آخری اور انتہائی مقصود آخرت ہوتی ہے۔ یہاں یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ مقصود آخرت کو بنا لیا جائے تو دنیا ضمناً بھی مل سکتی ہے لیکن آخرت اتنی سستی نہیں ہے کہ دنیا کو مطلوب و مقصود بنا لینے کی صورت میں وہ خود بخود مل جائے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ دنیا اور آخرت میں سے انسان جس کو بھی اپنی ترجیح اوّل بنائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اُس کی کوششوں اور کاوشوں کا رُخ اُس طرف مڑ جائے گا جس کی بنا پر دوسری سے توجہ ہٹ جائے گی یا کم ہو جائے گی تو اُس میں کچھ نہ کچھ نقصان بھی برداشت کرنا ہو گا کقولہ علیہ السلام:

(من أحب دنياه اضربا خرته ومن أحب آخرته اضر بدنياه فآثر وما يبقىٰ على مايفنىٰ)(۳۸)

---

(۳۶)الاعلیٰ ۸۷ : ۱۶-۱۷

(۳۷)البقرہ ۲ : ۲۰۰-۲۰۲

(۳۸)(حاکم، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن محمد، المستدرک علی الصحیحین، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۱۱ھ، رقم:۷۸۵۳، ۴/ ۳۴۳

"جو شخص دنیا سے محبت کرے گا(یعنی دنیا کو آخرت پر ترجیح دے گا)وہ آخرت کا نقصان کر لے گا اور جو شخص آخرت سے محبت کرے گا(یعنی آخرت کو دنیا پر ترجیح دے گا)وہ اپنی دنیا کا نقصان کر لے گا۔ پس تم باقی رہنے والی چیز(یعنی آخرت)کو فنا ہو جانے والی چیز(یعنی دنیا)پر ترجیح دو۔"

جب صورتِ حال یہ ہے تو وہ انسان جس کے اندر ایک زندہ اور شعوری ایمان موجود ہو وہ دنیا کا نقصان تو گوارا کر سکتا ہے لیکن آخرت کا نقصان کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔

اُوپر والی گفتگو سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو دنیوی سرگرمیوں میں پُر جوش انداز میں حصہ لینے سے منع کرتا ہے۔ اسلام کا کہنا تو یہ ہے کہ یہ ساری کائنات انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے:

﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَه ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً﴾ (۳۹)

"کیا تم نے نہیں دیکھا جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اللہ نے تمہارے کام پر لگا رکھا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں "

گویا پوری کائنات اور اُس کے مظاہر کو بنایا ہی اس انداز میں گیا ہے کہ وہ انسان کے لیے مسخر ہو سکیں۔ انسان اُنہیں اپنے قابو میں لا کر حسبِ منشاء اُن سے کام لے سکے۔ اب یہ انسان کی ہمت، طلب، جستجو اور حوصلے پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک وسائلِ حیات اور مظاہر کائنات پر قابو پا کر اُنہیں اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ سب کچھ مطلوب اور مقصود ہے صرف اس شرط کے ساتھ کہ یہ چیزیں کسی بھی درجے میں بذاتِ خود مطلوب و مقصود نہ بن جائیں بلکہ مقصودِ حیات بہر حال اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی ہونا چاہیے۔ قرآنِ مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللّٰهُ عِنْدَه اَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ (۴۰)

"تمہارے مال اور اولاد تمہارے لیے محض آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس تو بڑا اجر ہے"

---

(۳۹)لقمان ۳۱ : ۲۰

(۴۰)التغابن ۶۴ : ۱۵

گویا مال و اولاد جو دنیوی زندگی میں ایک طرف اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں دوسری طرف یہ انسان کے لیے بہت بڑی آزمائش اور امتحان بھی ہیں جن کے حوالے سے صحیح طرزِ عمل اپنا کر وہ آخرت میں سرخرو بھی ہو سکتا ہے جب کہ غلط طرزِ عمل اپنانے کی وجہ سے ناکام و نامراد ہو سکتا ہے۔ اس حوالے سے حضور علیہ السلام نے فرمایا:

(ان لكل أمة فتنة وفتنةُ أمتي المال) (۴۱)

"بے شک ہر اُمت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے"

اس حدیثِ مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر اُمت میں امتحان اور آزمائش کی کوئی ایک صورت بطورِ خاص رہی ہے اور اس اُمت کے لیے یہ مخصوص صورت دنیا کا مال و دولت اور اسبابِ دنیا ہے۔ چنانچہ ہر دور میں دنیا کی رونقیں انسان کے لیے بہت بڑی آزمائش رہی ہیں اور بہت سارے فساد جرائم اور قتل و غارت گری کا نمایاں سبب رہی ہیں لیکن اس دور میں یہ فتنہ ماضی کے تمام ادوار کی نسبت کئی گناہ بڑھ گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے زندگی کے دامن میں لذتوں، راحتوں آسائشوں اور زیب و زینت کے ان گنت سامان ڈال دیے ہیں جن کی بنا پر دنیا پہلے سے کہیں زیادہ رنگین اور دلکش ہو گئی ہے یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے لوگوں کے لیے اس کی سحر انگیزی سے دامن بچانا مشکل ہو گیا ہے۔ چنانچہ آج کا انسان مادی لوازمات کے حصول کو ہی زندگی کا اوّل و آخر مقصد سمجھ کر دیوانہ وار اُن کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور اس سفر میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اخلاقی اقدار پامال ہو رہی ہیں اور اُصولوں اور ضابطوں کو ماضی کی فرسودہ اور دقیانوسی باتیں سمجھ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ مادیت پرستی کی دوڑ میں انسان اتنا آگے نکل گیا ہے کہ رشتوں کا تقدس ختم ہو رہا ہے۔ خلوص، محبت، مروت، حیا، وفا اور ہمدردی و خیر خواہی جیسے الفاظ اپنی اہمیت کھو رہے ہیں۔ اُن کی جگہ، لالچ، طمع، خود غرضی، بے مروتی، بے وفائی، بے حیائی، بے حسی اور سرد مہری جیسی قدریں رواج پا رہی ہیں۔ انسانوں کا معاشرہ جنگل کا نمونہ پیش کر رہا ہے جہاں کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس صورتِ حال کو بدلنا ہو گا ورنہ تیزی سے زوال اور پستی کی طرف جانے والے اس سفر کا آخری انجام تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اخلاقی انحطاط کے اسباب

عصرِ حاضر میں ہمہ گیر نوعیت کا اخلاقی انحطاط جو ہر سمت میں دکھائی دے رہا ہے اُس کے کئی اسباب ہیں اُن میں سے چند نمایاں ترین اسباب کو سطورِ ذیل میں اختصار کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

---

(۴۱) حاکم، المستدرک علی الصحیحین، رقم: ۷۸۹۶، ۴/ ۳۵۴

ا۔ جہالت

قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَه﴾ (۴۲)

"اور کون ہے جو ملت ابراھیمی سے روگردانی کرے سوائے اس کے جو خود ہی احمق ہو "

یہاں ملتِ ابراھیمی جو کہ فطرتِ سلیمہ کا تقاضا ہے اُس سے اعراض کی وجہ جہالت کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ جہالت ہی ہے جو حقیقت کے چہرے پر پردہ ڈال دیتی ہے اور انسان کو گمراہی اور بے راہ روی کی وادیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتی ہے۔ جس طرح رات کی تاریکی میں انسان کو کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ ادھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے ایسے ہی جاہل آدمی فکری انتشار میں مبتلا ہوتا ہے اور ظن و تخمین اور ھوائے نفس کا شکار ہو کر راست روی سے دور ہٹتا چلا جاتا ہے۔

سقراط کے ایک مشہور قول کا مفہوم ہے:

"نیکی علم ہے اور بدی جہل" (۴۳)

اسلام کے نزدیک علم سے مراد کسی مخصوص شعبے کا علم نہیں ہے جس سے انسان کا روزگار وابستہ ہو بلکہ وہ علم جو کائنات کے حقائق کو اُس پر آشکار کر دے اور زندگی کے قوانین سے آگاہ کر دے۔ اس میں قرآن و حدیث تو بدرجہ اولیٰ شامل ہیں تاہم جدید علوم کی بھی نفی نہیں ہے بلکہ اُن میں مہارت حاصل کرنا بھی مطلوب اور مستحسن ہے۔ قرآن و حدیث اور اسلامی لٹریچر میں اس حوالے سے دو الفاظ استعمال ہوتے ہیں ایک تعلیم اور دوسرا تربیت۔ یہ دونوں الفاظ اگرچہ ایک دوسرے کے مترادف ہیں اور ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں تاہم پھر بھی ان دونوں میں فرق ہے۔ تربیت کے مقابلے میں تعلیم کا دائرہ کار محدود ہے۔ تعلیم کے ذریعہ صرف عقلی قوتوں کو اُجاگر کیا جاتا ہے جب کہ تربیت کے ذریعہ انسان کی جملہ فطری قوتوں کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر "تربیت سے مراد انسان کی جسمانی، عقلی، روحانی اور فکری قوتوں کو اُجاگر کرنا ہے اور پرورش کے ذریعے اُن کی مخفی صلاحیتوں کو کمال تک پہنچانا ہے۔

---

(۴۲) البقرہ ۲ :۱۳۰

(۴۳) ولی الدین، میر، ڈاکٹر، قرآن اور تعمیر سیرت، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۲

جب ایک بچہ دُنیا میں آتا ہے تو اُس کا پاک دل ایک صاف شفاف عمدہ جوہر کی مانند ہوتا ہے، جو ہر طرح کے نقش و نگار سے خالی ہوتا ہے۔ اس پر جس طرح کا نقش جمانا چاہیں جم جائے گا۔ اگر اچھی عادتوں کا خوگر بنایا گیا اور تعلیم و تربیت کا عمدہ بندوبست کیا گیا تو وہ دنیا و آخرت میں سعادت مند ہو گا اور اُس کے والدین، مربی اُس کے اجر و ثواب میں برابر کے شریک ہوں گے اور اگر اُس کی تعلیم و تربیت میں غفلت برتی گئی اور اُسے بُری عادتوں کا خوگر بنایا گیا تو وہ ہلاک و برباد ہو گا اور اُس کی ذمہ داری اُس کے سرپرستوں پر ہو گی۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (۴۴)

"اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ سے"

المیہ یہ ہے کہ آج تعلیم سے تربیت کو جدا کر دیا گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں انسان سازی کا کام رُک گیا ہے۔ پھر تعلیم کا تصور بھی محض کسی خاص شعبے میں پیشہ وارانہ مہارت تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جس کی وجہ سے انسان پڑھ لکھ کر ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان، بزنس مین وغیرہ میں سے کوئی ایک بن جاتا ہے لیکن صحیح معنوں میں انسان نہیں بن پاتا اور اخلاقی اعتبار سے بہت ساری کمیوں کا شکار ہوتا ہے اور زندگی کے اندر توازن نہیں ہوتا۔ آج معاشرہ میں بہت ساری خرابیوں کی وجہ جہالت ہے۔ توہم پرستی، فرقہ واریت، رسوم و رواج کی اندھا دھند پیروی اور مختلف قسم کے تعصبات وغیرہ جیسے کتنے ہی معاشرتی امراض میں جو جہالت کی آغوش مین پروان چڑھتے ہیں اور معاشرے کے فطری ارتقاء اور ترقی میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔

تعلیم و تربیت پر مندرجہ ذیل چار عوامل (Agencies) اثرانداز ہوتے ہیں۔

۱۔ گھر ۲۔ مدرسہ یا سکول

۳۔ معاشرہ ۴۔ مملکت یا حکومت

یہی وہ چار ادارے ہیں جن کے سانچے میں ڈھل کر کسی فرد کی شخصیت نشوونما کے مراحل طے کرتی ہے۔ بد قسمتی سے آج ان چاروں میں ہی بگاڑ آچکا ہے اور کسی بھی جگہ وہ مثالی ماحول نہیں ہے جس میں پروان چڑھ کر اعلیٰ اخلاقی صفات کی حامل شخصیات معرضِ وجود میں آئیں۔ چنانچہ ہر آنے والے دن میں بگاڑ اور زوال کی رفتار بڑھتی جارہی ہے۔ اور اسے روکنے کی کوئی بھی کوشش کارگر نہیں ہو رہی۔

---

(۴۴) التحریم ۶۶ : ۶

۲۔ غربت

اخلاقی بگاڑ کا ایک اہم سبب غربت ہے جس کی وجہ سے انسان بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی کئی قسم کی اخلاقی قباحتوں کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے غربت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

(كاد الفقر أن يكون كفرا) (۴۵)

مطلب یہ ہے کہ فقر و فاقہ اور تنگدستی کی حالت انسان کو اس حد تک مجبور کر سکتی ہے کہ وہ کُفر کی طرف جانے پر آمادہ ہو جائے جو کہ بد اخلاقی کا آخری درجہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کے کچھ بنیادی تقاضے مثلاً کھانا پینا وغیرہ ایسے ہیں جن کے بغیر اُس کا گزارا ہی نہیں ہے۔ اگر کچھ وقت کے لیے ان تقاضوں کی تکمیل نہ ہونے پائے تو انسان کے دل و دماغ میں اضطراب اور بے چینی کی کیفیت جنم لینے لگتی ہے جو ایک حد سے بڑھ جائے تو ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان ایسے اعمال کا ارتکاب بھی کر گزرتا ہے جن کے متعلق معمول کے حالات میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا قول ہے:

"اخلاق، حالات سے پیدا ہوتے ہیں، محض علوم سے نہیں"(۴۶)

اس بلیغ جملے میں شاہ ولی اللہؒ نے انسانی زندگی کی اس اہم حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اخلاق اور معیشت کا گہرا تعلق ہے۔ جب تک کسی شخص کی کم از کم معاشی ضروریات کو پورا نہ کیا جائے اُس سے اخلاقِ فاضلہ کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ مولانا سید ابوالحسن ندویؒ نے شاہ ولی صاحب کے اس طرزِ فکر کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"شاہ ولی اللہ نے علمائے اخلاق اور ماہرین اقتصادیات میں پہلی مرتبہ علم المعیشت کا علم الاخلاق سے گہرا تعلق ثابت کیا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک جب یہ ربط ٹوٹ جاتا ہے تو معاشیات اور اخلاقیات دونوں کو شدید بحران سے واسطہ پڑتا ہے جس کا اثر مذہب و اخلاق، پر سکون زندگی، انسانوں کے باہمی روابط اور تہذیب و تمدن سبھی پر پڑتا ہے۔ اُن کے نزدیک انسانوں کے اجتماعی اخلاق اُس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے اُن کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔ اس وقت انسان، جن کے اندر اللہ نے اعلیٰ روحانی ملکات اور ترقی کے امکانات

---

(۴۵) کنز العمال، رقم: ۱۶۶۸۲، ۶/ ۲۱۰

(۴۶) شاہ ولی اللہ، محدث دہلوی، قطب الدین، البدور البازغہ، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد، سندھ، ۱۹۷۰ء، ص ۵۰

ودیعت فرمائے ہیں، گدھے اور بیل کی طرح روٹی حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہنے لگتے ہیں اور ہر طرح کی سعادتوں اور ترقیوں سے محروم ہو جاتے ہیں"۔ (۴۷)

انسانی معاشروں میں دیگر خصوصیات اور صلاحیتوں کے علاوہ درجاتِ معیشت کا تفاوت بھی صورتِ واقعہ اور حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول قرآنِ مجید:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا﴾ (۴۸)

" ان کی روزی تو ہم نے ان کے درمیان دنیا کی زندگی میں تقسیم کی ہے، اور ہم نے بعض کے بعض پر درجے بلند کیے تاکہ ایک دوسرے کو محکوم بنا کر رکھے "

قرآنِ مجید نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ انسانوں کی ضروریات اسی طرح پوری ہو سکتی ہیں اور باہمی تعاون کا مقصد بھی اسی سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن اس فرق کو فطری حدود کے اندر رہنا چاہئے۔ یہی تفاوت جب حد سے بڑھنے لگے اور معاشرے کے دو طبقوں کے درمیان ناقابلِ عبور خلیج کی صورت اختیار کرنے لگے تو پھر ایک محدود طبقہ لا محدود وسائل پر قابض ہو جاتا ہے جب کہ بہت بڑی اکثریت کے لیے دو وقت کی روٹی کا حصول اور جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے یہ صورتِ حال کسی بھی معاشرے کے لیے ایک المیہ ہوتی ہے۔ جو محروم اور پسماندہ طبقات کے ذہنوں میں منفی رجحانات پیدا کرتی ہے جن کا نتیجہ اخلاقی بگاڑ کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ ریاست میں حکومت کے لیے لوگوں کے بنیادی لوازماتِ حیات کی فراہمی کو اہم ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔

دنیا کے خالق نے یہاں وسائل فراوانی سے مہیا کیے ہیں لیکن اُن وسائل کی تقسیم میں ناانصافی، حکمران طبقے کی لوٹ مار، اقربا پروری، بد دیانتی اور اسراف نیز جاگیر داری اور سرمایہ داری پر مشتمل استحصالی نظام ہے جو وسائل کو چند ہاتھوں میں مرتکز کر دیتا ہے اور لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہوتی ہے۔

---

(۴۷) بشیر احمد شیخ، شاہ ولی اللہ کا نظریہ عمرانیات و معاشیات، مکی دارالکتب، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۶۴-۱۶۵

(۴۸) الزخرف ۴۳:۳۲

۳۔ عیش و عشرت

جس طرح بہت زیادہ غربت اخلاقی مسائل کا باعث بنتی ہے اسی طرح حد سے بڑی ہوئی امارت بھی انسان کو اخلاقی اعتبار سے ناکارہ کر دیتی ہے۔ مال و دولت اور وسائلِ حیات کی فراوانی سے انسان میں بے فکری پیدا ہوتی ہے اور وہ انواع و اقسام کی لذتوں، راحتوں، آسائشوں، تن آسانیوں اور عیش و عشرت کا دلدادہ بنتا چلا جاتا ہے جس کے نتیجے میں اخلاقی زوال اور انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے دامن میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جہاں عیش و عشرت میں مبتلا قومیں اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو گئیں۔ ماضی بعید میں رومی اور ایرانی قوموں جب کے ماضی قریب میں مغلیہ حکمران کی عیاشی اور مسرفانہ زندگی اور اُس کے عبرتناک انجام کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اسلام میں بہت زیادہ عیش و عشرت کو اسی لیے ناپسند کیا گیا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے:

(إياك والتنعم فإن عباد الله ليسوا بالمتنعمين)) (۴۹)

"اپنے آپ کو لذت طلبی سے بچانا۔ اللہ کے بندے لذتوں کے عادی نہیں ہوتے۔"

حضور علیہ السلام کی دعاؤں میں سے ایک دُعا ہے جس میں غربت اور امارت دونوں کے فتنہ سے پناہ مانگی گئی ہے:

(ومن شر فتنة الغنى وأعوذبك من فتنة الفقر) (۵۰)

"اور میں امارت اور غربت کے فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں"

چنانچہ حد سے بڑھا ہوا فقر ہو یا اسراف و تبذیر دونوں ہی انسان کو اُمورِ سعادت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے بارے میں غور و فکر کی صلاحیت سے عاری کر دیتے ہیں اور انسان کی توجہ اخلاقِ عالیہ سے ہٹ جاتی ہے۔ پسندیدہ طرزِ زندگی یہ ہے کہ انسان مناسب حد تک اپنی ضروریات پوری کرتا ہو۔ مال و دولت سے تنفر مناسب نہیں کہ یہ ایک نعمت ہے اور ضروریاتِ زندگی کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ لیکن انسان کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ کچھ وقت فرصت کا نکالے اور سعادتِ اُخروی کے حصول پر توجہ دے۔ یہ مقصد اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اُس کی معیشت تنعّم پسندی اور فقر و مسکنت دونوں کے درمیان اعتدال اور توازن پر مبنی ہو۔

---

(۴۹) ہیثمی، نور الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر بن سلیمان، مجمع الزوائد، دار الریان للتراث، بیروت، ۱۴۰۷ھ، ۱۰/ ۲۵۰

(۵۰) بخاری، رقم: ۶۰۰۷، ۵/ ۲۳۴۱

۴۔ سماجی عدل کا فقدان

اسلام نے جن اخلاقی اور معاشرتی اُمور پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اُن میں سے ایک عدل ہے۔ عدل کے لفظی معنی ہیں کسی چیز کو برابر دو حصوں میں تقسیم کرنا۔ اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اُس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی جائے اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اُترے۔ اس کے معنی کسی چیز کو اُس کے صحیح موقع محل میں رکھنے کے بھی ہیں۔ اور اس کی ضد ظلم کا لفظ ہے جس کے معنی کسی چیز کو کسی غلط جگہ رکھنا ہے جو اس کے لیے مناسب نہ ہو۔ پس اسلامی اخلاق کی رو سے عدل و انصاف کا معنی ہے ہر شخص کے ساتھ بلا رو و رعایت وہ معاملہ کرنا جس کا وہ حق دار ہے۔ انبیاءؑ کی بعثت کا اہم ترین مقصد عدل و انصاف پر مبنی انسانی معاشرہ کا قیام ہوتا ہے۔ کقولہ تعالیٰ:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (۵۱)

"البتہ ہم نے اپنے رسولوں کو نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ہمراہ ہم نے کتاب اور ترازوئے (عدل) بھی بھیجی تاکہ لوگ انصاف کو قائم رکھیں"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ حسنہ اور آپؐ کے خلفائے راشدین کے طرزِ حکومت پر نگاہ ڈالیں تو بے لاگ عدل ہی ان حکومتوں کا بنیادی رکن نظر آتا ہے۔ ایسا عدل جو اپنے و بیگانے، مسلم و غیر مسلم، عربی و عجمی اور امیر و غریب سب کے لیے یکساں اور بلا امتیاز ہو۔ عدل و انصاف وہ صفت ہے جس پر دنیا کا نظام قائم ہے۔ جس قوم اور جس معاشرے میں عدل و انصاف نہ ہو وہ رحمتِ خداوندی سے محروم رہتا ہے اور دنیا میں بھی ذلت و رسوائی اُس کا مقدر بنتی ہے۔ عدل کسی بھی معاشرہ کو چلانے میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ عدل انفرادی ہو یا اجتماعی، جو معاشرہ اس سے صرفِ نظر کرتا ہے اُس کی شکست و ریخت نوشتہ دیوار بن جاتی ہے۔

چنانچہ کسی معاشرہ میں عدلِ اجتماعی کا ماحول نہ ہونا اُس میں کئی طرح کی خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ نہ مظلوم کی داد رسی ہوتی ہے اور نہ ظالموں کو اُن کے کیے کی سزا ملتی ہے۔ ظلم و بربریت اور جبر و تشدد کا ماحول ہوتا ہے کسی کی جان، مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں ہوتی جس کے نتیجے میں حرص، لالچ، طمع، خود غرضی، بے حسی اور سنگدلی جیسے اخلاقی امراض جنم لیتے ہیں جو معاشرے کو انسانیت کے بلند مقام سے گرا کر حیوانیت کی چراگاہ بنا دیتے ہیں۔

---

(۵۱) الحدید ۵۷:۲۵

۵۔ماحول کی آلودگی

انسان جس بھی ماحول میں رہ رہا ہو اُس کے اثرات اُس کی شخصیت پر لازماً پڑتے ہیں۔ یہ اثرات جسمانی و ذہنی بھی ہو سکتے ہیں اور روحانی و اخلاقی بھی۔ جدید دور کا ایک بہت بڑا مسلہ ماحول کا آلودہ ہونا ہے۔ غیر فطری طرزِ زندگی اور جدید مادی ایجادات کے مسرفانہ اور غیر محتاط استعمال نے ماحول میں بہت زیادہ آلودگی پیدا کر دی ہے جو لوگوں کی جسمانی صحت کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر اُن کے اخلاق پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ اس آلودگی کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اخلاقی انحطاط کے اثرات و نتائج:

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو امتحان گاہ بنایا ہے اور یہاں امتحان کی غرض سے ہر انسان کو ایک مخصوص مدت کے لیے رکھا جاتا ہے۔ انسان عمل کرنے میں تو آزاد ہے لیکن اُس کے انجام سے بچنے میں آزاد نہیں ہے۔ پھر قانونِ قدرت یہ بھی ہے کہ انسان اچھا یا بُرا جو عمل بھی کرتا ہے اُس کا اصلی اور حقیقی بدلہ تو آخرت میں ہی ملے گا لیکن ایک ابتدائی بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے۔ اس بات کی وضاحت قرآنِ مجید کی مندرجہ ذیل دو آیات سے کی جا سکتی ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّه حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (۵۲)

"جس نے نیک کام کیا مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے تو ہم اسے ضرور اچھی زندگی بسر کرائیں گے، اور ان کا حق انہیں بدلے میں دیں گے ان کے اچھے کاموں کے عوض میں جو کرتے تھے"

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَه مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُه يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى﴾ (۵۳)

"اور جو میرے ذکر سے منہ پھیرے گا تو اس کی زندگی بھی تنگ ہو گی اور اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے"

---

(۵۲) النحل ۱۶:۹۷

(۵۳) طٰہٰ ۲۰:۱۲۴

پہلی آیت میں بتایا گیا کہ نیک اعمال کرنے والے کو آخرت میں تو بہترین بدلہ ملے گا ہی لیکن دنیا میں بھی اُسے پاکیزہ اور باوقار زندگی میسر آئے گی۔ جب کہ دوسری آیت میں اللہ کی یاد اور اُس کی اطاعت سے منہ موڑنے کا نتیجہ اُخروی سزا کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی میں رزق کی تنگی (رزق سے برکت کا اُٹھ جانا، رزق کے حوالے سے فقر و فاقہ اور تنگدستی کے اندیشوں میں مبتلا ہونا وغیرہ) بتایا گیا ہے۔ چنانچہ اخلاقِ حسنہ کو اپنانے کی صورت میں انسان دنیا و آخرت کی سعادتوں کا مستحق بنتا چلا جاتا ہے جب کہ اخلاقی زوال اور انحطاط کا نتیجہ دونوں جگہوں پر بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ قانون فرد کے لیے بھی ہے اور یہی اقوام کے لیے بھی۔ خدا کے قانون میں کسی کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے:

﴿سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ (۵۴)

"یہی اللہ کا قانون ہے ان لوگوں میں جو اس سے پہلے ہو گزر چکے ہیں، اور آپ اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی ہر گز نہ پائیں گے"

اقوامِ عالم کی پوری تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو ہر جگہ اس قانون کی کار فرمائی دکھائی دیتی ہے،۔ تاریخ کے ہر دور میں جب اور جہاں بھی کسی فرد یا قوم نے اخلاقی اُصولوں کی پاسداری کی اللہ نے اُسے عزت و آبرو اور امن و عافیت والی زندگی عطا کی اور جہاں ان اُصولوں سے روگردانی کی گئی وہاں بالا خر قانونِ مکافاتِ عمل حرکت میں آیا اور خلاف ورزی کرنے والے فرد یا قوم کو دوسروں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ عصرِ حاضر کا انسان اخلاقی اُصولوں کو پامال کرنے کی سزا انفرادی اور اجتماعی سطح پر کس طرح بھگت رہا ہے اس کی ایک ہلکی سی جھلک ذیل کی سطور میں دکھائی جا رہی ہے۔

ا۔ سکون و اطمنان سے محرومی

انسان دو چیزوں سے عبارت ہے۔ ایک جسم اور دوسری روح۔ جسم انسانی شخصیت کا دکھائی دینے والا حصہ ہے جو مادی اجزاء سے بنا ہوا ہے چنانچہ اُس کے تقاضے بھی اسی مادی دنیا سے متعلق ہیں۔ جسم کی بقاء اور ارتقاء کے لیے جو لوازمات درکار ہیں وہ ہمارے ارد گرد بکھرے ہوئے ہیں لیکن روح ایک ایسی لطیف چیز ہے جس کا تعلق اس مادی دنیا سے نہیں ہے بلکہ خالق کائنات سے ہے۔

﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ (۵۵)

---

(۵۴) الاحزاب ۳۳:۶۲

"کہہ دو روح میرے رب کے حکم سے ہے"

﴿فَاِذَا سَوَّيْتُه وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَه سَاجِدِيْنَ﴾ (۵۶)

"پھر جب میں اسے ٹھیک بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا"

چنانچہ روح کو ان مادی سامانوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اُس کی صحت مندی اور تروتازگی کا دارومدار اللہ کی محبت، تعلق، یاد اور اُس کی اطاعت و بندگی پر ہے۔ اس دور کے انسان کا المیہ یہ ہے کہ اس کی توجہ کا مرکز و محور جسم کے تقاضے بن چکے ہیں جب کہ روح مسلسل نظر انداز ہو رہی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جسم تو پھل پھول رہا ہے لیکن روح کی غذا مطلوبہ مقدار میں نہ ملنے کی وجہ سے وہ ایک قسم کے فاقہ میں مبتلا ہے اور وہ مضطرب اور بے چین ہے۔ انسان اپنی شخصیت کے اِس خلا کو مادی سازو سامان سے پورا کرنا چاہتا ہے اور اپنے قلبی سکون و اطمینان کو محض مادی لذتوں اور آسائشوں کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے جو کہ ناممکن ہے کیونکہ بقول قرآنِ مجید:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (۵۷)

"خبردار! اللہ کی یاد ہی سے دل تسکین پاتے ہیں"

اس نکتہ کو ایک مادی مثال کے ذریعے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر ایک آدمی کسی دستر خوان پر موجود ہو جہاں رنگ برنگی اور اعلیٰ درجے کی لذیز نعمتیں وافر مقدار میں موجود ہوں لیکن پانی یا کوئی اور مشروب نہ ہو۔ کھانے کے دوران جب اُسے پیاس لگے گی تو وہاں موجود دوسری کوئی بھی چیز اُس پیاس کی تسکین نہیں کر سکے گی اور نتیجتاً طبعیت میں ایک بے چینی اور اضطراب جنم لے گا جو کسی طرح ختم نہیں ہو گا۔ یہی حال آج کے انسان کا ہے۔ تمام تر مادی سہولتوں، لذتوں، راحتوں اور آسائشوں کے باوجود اُس کا اندرونی اضطراب اور خلفشار ختم ہونے میں نہیں آرہا۔ اس سے دوسری بہت ساری قباحتیں جنم لے رہی ہیں۔

---

(۵۵) الاسراء ۱۷:۸۵

(۵۶) الحجر ۱۵ : ۲۹

(۵۷) الرعد ۱۳ : ۲۸

۲۔ احساسات کا ضعف:

انسان کوئی مشینی وجود نہیں ہے نہ ہی محض گوشت پوست کا بنا ہوا ہے ظاہری ڈھانچہ ہے بلکہ اس کے اندر ایک دھڑکتا ہوا دل اور پھڑکتا ہوا دماغ بھی ہے جس میں نازک جذبات اور لطیف احساسات رکھے گئے ہیں جن میں سوز و گداز، محبت و مروت، ہمدردی و خیر خواہی اور ایثار و قربانی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عصرِ حاضر کی مشینی زندگی نے انسان کو بھی مشینی انداز میں ڈھال دیا ہے اور اُس کا یہ قیمتی سرمایہ اُس سے چھین لیا ہے بقول اقبال۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات (۵۸)

احساسِ مروت سے مراد دل میں سوز و گداز اور تڑپ کا ہونا ہے۔ یہ احساس اقبال کے نزدیک اتنا اہم ہے کہ وہ اسے کسی بھی قیمت پر بیچنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی (۵۹)

چنانچہ مہر و وفا، خلوص، اپنائیت اور چاہت وغیرہ کے جذبات جو کبھی انسان کا طرّۂ امتیاز ہوا کرتے تھے آج کا انسان ان سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی بجائے خود غرضی، لالچ، طمع، لاپرواہی اور بے حسی و سنگدلی جیسی منفی اقدار سکّہ رائج الوقت بنتی چلی جا رہی ہیں۔ ہر کوئی اپنی ذات کے خول میں بند ہے۔ یہ بے التفاتی و لاپرواہی صرف عام انسانوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ قریبی رشتوں میں بھی واضح طور پر محسوس ہو رہی ہے۔ مشینی آلات اور جدید ایجادات کی بھرمار نے انسان کو دوسرے لوگوں سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اس صورتِ حال نے انسانوں کی بستی کو حیوانوں کی بستی میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے جہاں کسی کو دوسرے کے حال سے کوئی غرض نہیں ہوتی اور ہر کوئی اپنے لیے جی رہا ہوتا ہے۔

۳۔ نفسیاتی امراض میں اضافہ

روحانی افلاس اور اخلاقی انحطاط کا ہی ایک شاخسانہ نفسیاتی مسائل ہیں۔ یوں تو تاریخ کے ہر دور میں جسمانی امراض کی طرح نفسیاتی امراض بھی موجود رہے ہیں۔ لیکن عصرِ حاضر کی غیر فطری اور تکلفات و تعیّشات سے لبریز طرزِ

---

(۵۸) بالِ جبریل، ص ۱۱۱/ ۴۳۵

(۵۹) بالِ جبریل، ص ۲۸/ ۳۵۲

زندگی نے انسان کو اخلاقی انحطاط کی جس پستی میں دھکیل دیا ہے اُس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ذہنی و نفسیاتی مسائل بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ انسان کے اندر ضمیر (Cnscience) کی صورت میں ایک محاسب (Auditer) رکھا گیا ہے جو اُسے ہر غلط کام پر ٹوکتا ہے۔ جب انسان ضمیر کی آواز کو نظر انداز کرتے ہوئے اخلاقی اُصولوں کو پامال کرتا ہے اور راست روی کے خلاف چلتا ہے تو اُس کے اندر ایک کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ جسے کبھی شعوری طور پر بھی محسوس کر لیا جاتا ہے اور کبھی یہ لاشعور کی سطح تک رہ جاتی ہے۔ یہی کشمکش جب بڑھتی ہے تو قلق اور اضطراب کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس سے بہت سارے نفسیاتی امراض جنم لیتے ہیں۔ چنانچہ ڈر، خوف، وہم، وسوسے، بے بنیاد خدشے، اندیشے، اینگزائٹی اور ڈپریشن وغیرہ جیسے کتنے ہی امراض ہیں جن میں آج کے دور میں انسانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت مبتلا ہے۔ پھر یہی امراض بہت ساری جسمانی بیماریوں کا بھی باعث بنتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کے ذریعے دواؤں اور مختلف نفسیاتی تراکیب سے وقتی طور پر تو کچھ افاقہ ہو جاتا ہے لیکن جب تک کسی مسئلے کی جڑ کو نہ پکڑا جائے تو محض شاخوں اور پتوں کی تراش خراش سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آج لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نفسیاتی امراض کی آگ میں جل رہی ہے لیکن کوئی راہ سوجھائی نہیں دے رہی۔

۴۔ منشیات کا استعمال

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو کسی بھی قسم کے نشے کا نہ صرف عادی نہیں ہوتا بلکہ اُس کی فطرتِ سلیمہ ہر قسم کی منشیات کے استعمال سے نفرت کرتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ بہت سے لوگ نشہ کی مختلف اقسام کے عادی ہو کر زندگی کے حقیقی لطف سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نہ عزتِ نفس رہ جاتی ہے اور نہ ہی زندگی میں کوئی اعلیٰ نصب العین موجود ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا وجود اپنے ساتھ ساتھ معاشرہ کے لیے بھی ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ جب تک زندہ رہتے ہیں زندگی ایک مردہ لاش کی طرح اُٹھائے پھرتے ہیں۔ بہت محدود پیمانے پر تو نشہ کا استعمال ماضی میں بھی ہوتا رہا ہے لیکن عصرِ حاضر میں تو یہ لعنت اتنی زیادہ پھیل چکی ہے کہ مہذب سماج کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بن چکی ہے اور اس مذموم کاروبار سے وابستہ لوگ ایک مافیا کا روپ دھار چکے ہیں جن کا ہر ملک میں باقاعدہ ایک منظم نیٹ ورک موجود ہوتا ہے منشیات کا عادی ہونے کے جو نمایاں اسباب ہیں اُن میں سے ایک بہت بڑا سبب وہ خلا ہے جو اخلاقی دیوالیہ پن کے نتیجے میں انسانی شخصیت میں پیدا ہوتا ہے۔ انسان اپنے اندر کے قلق، اضطراب، بے چینی اور پریشانی کو ختم کرنے کے لیے کسی نہ کسی سہارے کی تلاش میں ہوتا ہے اور نشہ کا استعمال وقتی طور پر اس ضرورت کو پورا کر دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ انسان اس کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے اور مقدار بھی بڑھتی چلی جاتی ہے اور بالآخر وہ وقت آجاتا ہے جب واپسی کی کوئی راہ سوجھائی نہیں دیتی اور وہ مردوں سے بدتر زندگی گزارتے ہوئے موت کے انتظار میں سانسوں کی تعداد پوری کر رہا ہوتا ہے۔ یہ صورتِ

حال متاثرہ فرد پر اثر انداز ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کے متعلقین اور معاشرے کی عمومی فضا پر کئی طرح کے منفی اثرات ڈال رہی ہوتی ہے مگر ہر کوئی صورتِ حال کے تدارک میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔

۵۔ سماجی جرائم میں اضافہ

عصرِ حاضر نے انسان کو جن مصائب اور مسائل میں مبتلا کیا ہے اُن میں ایک جرائم کی کثرت ہے۔ انسان کا اندرونی اضطراب اور قلق کبھی تو اُسے منشیات کی طرف لے جاتا ہے اور کبھی جرائم کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ آج کی دنیا میں جرائم جتنی تیزی سے پھیل رہے ہیں اور جس طرح جرائم کی نئی شکلیں معرضِ وجود میں آرہی ہیں وہ اہل فکر کے لیے بہت زیادہ تشویش کا باعث ہیں۔ چوری، ڈاکہ، زنا، قتل و غارت، جعل سازی، دھوکہ دہی، جوئے بازی، جیب تراشی اور بد دیانتی وغیرہ جیسے کتنے ہی جرائم ہیں جنہوں نے معاشرہ کے امن و سکون کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے اور جن سے دینا کا کوئی ملک بھی محفوظ نہیں ہے۔ جرائم کی روک تھام کے لیے ہر ملک میں بکثرت قوانین موجود ہیں نیز ہر جگہ ایسے حساس ادارے اور ایجنسیاں موجود ہیں جن کا کام جرائم کی شرح کو کم سے کم کرنا ہے اور امن و امان کو بحال رکھنا ہے۔ مگر اتنے اہتمام کے باوجود یہ شرح کم ہونے کی بجائے بڑھتی چلی جارہی ہے اور اس سیلاب کے سامنے بند باندھنے کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہو رہی ہیں وجہ یہی ہے کہ جب تک اصل سبب کو تلاش کر کے اُس کا تدارک نہیں کیا جائے گا تب تک ان تمام سطحی اور نمائشی اقدامات سے تھوڑا بہت افاقہ تو ہو جائے گا لیکن اُس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو گی۔ جرائم کے تدارک میں اکیلا قانون کسی بھی لحاظ سے کافی نہیں ہے اُس کے ساتھ لوگوں کی اخلاقی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کوشش کرنا بہت ضروری ہے۔

۶۔ خودکشی میں اضافہ

عصرِ حاضر کا ایک اور المیہ خودکشی کا بڑھتا ہوا رجحان ہے جب انسان کا اخلاقی اور معنوی وجود زوال اور انحطاط کا شکار ہو کر کھوکھلا ہو جاتا ہے تو اُس کے اندر وہ جرات، ہمت اور استقامت نہیں ہوتی جو زندگی کے نشیب و فراز کا مقابلہ کر سکے چنانچہ حالات کا جبر انسان کو مایوسی اور پست ہمتی کی اُس سطح پر لے جاتا ہے جہاں اُسے اُمید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی اور زندگی ایک بوجھ محسوس ہونے لگتی ہے۔ لہٰذا اُسے آسان راستہ یہی دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنے وجود کو ہی ختم کر دے تاکہ مسائلِ حیات کے کوہِ گراں سے نجات پا سکے۔ یوں ایک انتہائی قیمتی زندگی موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے اور متعلقین کے لیے بہت سارے مسائل چھوڑ جاتی ہے۔

۷۔ جمود اور بے عملی

مشینی زندگی نے لوگوں سے عزم و ہمت اور جہد مسلسل کا شعار چھین لیا ہے اور اُس کی جگہ اُنہیں بے عملی و جمود اور سستی و کاہلی میں مبتلا کر دیا ہے۔ آج کا انسان محنت و مشقت اور جفاکشی کے کاموں سے دور بھاگتا ہے۔ اُس کی بجائے وقتی تفریح، پست جذبات، سفلی خواہشات اور عارضی و فانی لذتوں میں تسکین ڈھونڈتا ہے۔ جس کے نتیجے میں زندگی حقیقی خوشیوں اور دائمی لذتوں سے محروم ہوتی چلی جارہی ہے۔ اب اس طرح کی زندگی میں وہ کیف اور سرور کیسے آسکتا ہے جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

دو عالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی [۶۰]

دینِ اسلام میں سستی و کاہلی، جمود و تعطل اور فضول اور بے کار کاموں میں مشغولیت کو اسی لیے ناپسند کیا گیا ہے کہ یہ انسان سے اعلیٰ اخلاقی اوصاف چھین لیتی ہے اور اُسے دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے ناکارہ بنا دیتی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

(من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه) [۶۱]

"آدمی کے اسلام کا حسن یہ ہے کہ وہ لایعنی کو ترک کر دے۔"

اس کی بجائے اسلام انسان کو محنت و مشقت اور جہد مسلسل کے کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ﴾ [۶۲]

"بے شک ہم نے انسان کو مصیبت میں پیدا کیا ہے"

﴿ یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ﴾ [۶۳]

---

(۶۰) بالِ جبریل، ص ۱۰۸/۴۳۲

(۶۱) ہندی، حسام الدین، کنز العمال، رقم: ۸۲۹۱، ۳/۲۵۵

(۶۲) البلد ۹۰:۴

(۶۳) الانشقاق ۸۴:۶

اے انسان! تو اپنے رب کے پاس پہنچنے تک کام میں کوشش کر رہا ہے پھر اس سے جا ملے گا۔

نیز حضور علیہ السلام نے فرمایا:

(إن الله عزوجل يحب معالى الأمور) (۶۴)

"اللہ تعالیٰ اعلیٰ امور کو پسند کرتے ہیں"

مندرجہ بالا فہرست کوئی حتمی اور قطعی نہیں ہے اس میں بڑی آسانی کے ساتھ کئی اور چیزوں کا اضافہ ہو سکتا ہے مگر اس مختصر سی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آج کا انسان فطری طرزِ زندگی سے منہ موڑ کر اور خلاقی اُصولول و اقدار کی خلاف ورزی کے نتیجے میں کس دلدل میں پھنس چکا ہے جہاں سے نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسانیت ثریا کی بلندیوں سے تحت الثرٰی کی پستیوں میں آگئی ہے۔ یہ صورتِ حال خود انسانیت کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا رہی ہے کہ اگر زوال اور انحطاط کی رفتار یہی رہی اور ماحول کے انتشار اور پراگندگی میں یونہی اضافہ ہوتا رہا تو خدانخواستہ وہ وقت نہ آجائے جہاں انسانیت کے لیے اپنے وجود کو برقرار رکھنا ناممکن ہو جائے۔ عصرِ حاضر کے انسان کے سامنے یہ سوال ملین ڈالر کا ہے جسے حل کیا جانا بہت ضروری ہے۔

خلاصہ کلام

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اپنے ساتھ لذت و راحت اور آسائش و زیبائش کے جو سامان لے کر آئی ہے بلاشبہ اُنہوں نے زندگی کے حسن اور خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے اور اسی بنا پر آج کا انسان ماضی کی نسبت کہیں بہتر معیارِ زندگی کو اپنائے ہوئے ہے اور وہ ایسی سہولتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے جن کے متعلق ماضی کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر یہ تصویر کا ایک پہلو ہے۔ اسی معاملے کی دوسری جہت یہ ہے کہ یہ مادی ترقی اپنے ساتھ بہت سارے مسائل بھی لے کر آئی ہے جنہوں نے زندگی کا فطری حسن چھین لیا ہے اور اندرونی سکون و اطمینان سے آج کے انسان کو محروم کر دیا ہے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ انسان دنیوی سامانوں میں گم ہو کر اعلیٰ اخلاقی اقدار سے محروم ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں زندگی مصنوعی، کھوکھلی، سطحی اور بناوٹی بن گئی ہے۔ یہ صورتِ حال کسی طرح بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہ انسان کی آخرت کے لیے تو تباہ کن ہے ہی مگر اس نے دنیوی زندگی کو بھی جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ دوسری طرف تاریخ کا پہیہ اُلٹا نہیں گھمایا جا سکتا۔ جو ترقیاں ہو چکی ہیں

---

(۶۴) طبرانی، المعجم الاوسط، رقم: ۲۹۴۰، ۳/ ۲۱۰

اُنہیں ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا کوئی راہِ اعتدال تلاش کرنا ہو گی جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جو مسلمہ اخلاقی اقدار ہیں اُنہیں مضبوطی سے تھام لیا جائے اور کسی بھی قیمت پر اُن سے محرومی کو گوارانہ کیا جائے۔ زندگی کی تمام سہولتوں کو اخلاقی اقدار کے دائرے میں رہتے ہوئے پورا کیا جائے۔

تجدید دین: وسعت اور محدودیت

☆ حافظ محمد عمران
☆☆ محمد انوار الحسنین
☆☆ سید کاظم محمود کاظمی

ABSTRACT

With the passage of time, nature of human being has caught by the greed which affects of worships, theories and believes under it. But as Islam is a universal and final religion it does not allow remaining for a long time. The age which normally consists of a century which cause the dust and of illness in this age which is cleared and development is made due to revival process with the theory and believes. This process was carried in different angles. Revival of religion means to eradicate the additional things and theories which are interred and also to bring religion in original shape. During the past centuries the Muslims were totally disturbs in the world, but there movements of revival also rose from in this region.

Keywords: Renewal of Religion, Restrictions religious, Interpretive structure

جب سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا تو اللہ نے اس کی راہنمائی بذریعہ وحی، انبیاء و رسل فرمایا جس کی بدولت اس نے اپنے آپ کو ہر زمانہ میں جدید انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی اور طبیعتِ انسانی نئی سے نئی جہتوں کی تلاش میں لگ گئی۔ کیونکہ ایک مومن کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ تاریخی اثبات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن معاشروں، تہذیبوں اور ملکوں میں جدیدیت کا عنصر کمزور ہو جائے تو وہ زوال کا شکار ہو گئیں۔ انسانی زندگی کو ہر دم رواں دواں رکھنے کیلئے جدیدیت کا پہلو باقی رکھنا بے حد ضروری ہے ورنہ انسانی ذہن پر جمود طاری ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں انسانی صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت حرص و ہوس کا شکار ہو کر اسلامی عقائد و نظریات، عبادات و اعمال کو بھی اپنے زیر اثر کر لیتی ہے۔ لیکن اسلام چونکہ ایک آخری

☆ پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور
☆☆ ایم۔فل، منہاج یونیورسٹی، لاہور
☆☆ ایم۔فل اسلامک سٹڈیز، امپیریل کالج آف بزنس سٹڈیز، لاہور

اور آفاقی دین ہے وہ اس صورتحال کو زیادہ عرصہ کے لئے نہیں رہنے دیتا۔ اسی لئے تجدیدی عمل کے تسلسل کی وجہ سے ایک مخصوص عرصہ جو بالعموم ایک صدی پر مشتمل ہوتا ہے زمانے کی پڑی ہوئی گرد کو صاف کر کے صحیح عقائد و نظریات اور اعمال کی ترویج کر دی جاتی ہے۔

یہ طریقہ کار مختلف زمانوں اور ادوار میں مختلف انداز میں جاری رہا ہے۔ تجدید دین سے مراد وقت گزرنے کے ساتھ کسی مذہب یا نظریات عقائد میں خارجی ماحول داخل ہو جانے والی خرابیوں کو نکال کر دوبارہ اسے اصلی حالت پر استوار کر دینے کا نام ہے۔

تجدید کا لفظ تجدد سے ماخوذ ہے اور تجدد کا لفظ عربی زبان سے نکلا ہے جس کا مادہ ج۔د۔د۔ہے۔ اس مادے سے عربی زبان میں دو اہم الفاظ استعمال ہوتے ہیں ایک تجدد اور دوسرا تجدید۔ ایک باب تفعل سے اور دوسرا باب تفعیل سے ، باب تفعیل سے تجدید کا لفظ متعدی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ابن المنظور الافریقی لسان العرب میں فرماتے ہیں:

''تجدد الشيء صار جديدا و أجده و جدده و استجده أي صيره جديدا''(۱)

''مطلب کسی چیز کا تجدد اور تجدید کا مطلب ہے نیا ہونا۔''

المنجد میں ہے ،جَدَّ (نیا ہونا) جِدًّا ، جدّ أوَجد (نصیب والا ہونا) جَدَّدَ أو أَجَدَّ الشيء(نیا کرنا) أجد ثوبًا(نیا پہننا)(۲) عصر حاضر میں مذہبی اردو ادب میں تجدد ایک منفی اور تجدید ایک مثبت پہلو میں پایا جاتا ہے۔

تجدید دین کی اصطلاحی تعریف:

مجدّد ایک عربی لفظ ہے جو تجدید سے بنا ہے۔ جس کا معنی ہے: ''تازہ کرنا، نیا کرنا، اور جدّت پیدا کرنا'' جبکہ شارحین نے حدیثِ مجدّد کی شرح کرتے ہوئے اس کے کئی اصطلاحی معانی بیان کیے ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

''التجديد يحدث عندما تختفي آثار شيء ماء''(۳)

''تجدید اس وقت ہوتی ہے جب کسی چیز کے آثار ہی مٹ جائیں۔''

---

(۱) الافریقی، محمد بن مکرم بن منظور، (س۔ن)، لسان العرب، دار صادر، بیروت۔ ج۱، ص۵۶۳

(۲) بلیاوی، عبد الحفیظ، (س۔ن)، المنجد، عربی اردو، مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار لاہور۔، ص۱۰۵

(۳) ابن تیمیہ، احمد عبد الحلیم، (س۔ن)، مجموع الفتاویٰ، المکتبۃ العربیہ السعودیہ۔ ج۸، ص۸

علامہ محمد ظفر الدین بہاری لکھتے ہیں:

"تجدید کے معنی یہ ہیں کہ ان میں ایک صفت یا صفتیں ایسی پائی جائیں، جن سے امّت محمدیہ کو دینی فائدہ ہو۔ جیسے تعلیم و تدریس، وعظ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، لوگوں سے مکروہات کا دفع، اہلِ حق کی اِمداد۔"(۱)

مندرج بالا تعریفات سے معلوم ہوا کہ تجدید یا جدّد کے معنی ہیں نیا کرنا۔ کسی چیز پر بعد کو پیش آنے والے بگاڑ کو ختم کر کے اس کو اپنی پہلی صورت پر لے آنا۔ تجدید ایک فکری وضاحت ہے۔ اسلام کو ان تمام غیر اسلامی اثرات سے پاک کرنا اور کسی نہ کسی حد تک اپنی خالص صورت میں پھر سے فروغ دینے کی کوشش کرنا تجدید ہے۔ ایک مجدد معتدل ہونے کے ساتھ مصالحت پسند آدمی ہوتا ہے۔ وہ کسی خفیف سے خفیف جز میں بھی جاہلیت کی موجودگی کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ نہایت صاف دماغ اور بالکل سیدھا ذہن رکھتا ہوتا ہے۔ اس کی سوچ آزاد ہوتی ہے۔ وہ اسلام پر مکمل شرح صدر رکھتے ہوئے اجتہاد اور تعمیر نو کی غیر معمولی اہلیت رکھتا ہوتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کو اپنے مجدد ہونے کا علم ہو بلکہ اس کے دنیا سے جانے کے بعد لوگ اس کے کارناموں کو دیکھ کر اسے مجدد قرار دیتے ہیں۔ ایک مجدد کے کام کی مثال کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جیسے کہا جاتا ہے فلاں معاہدہ کی تجدید کی گئی ہے۔ یعنی معاہدہ پہلے سے موجود ہے، اس میں جزوی رد و بدل تو معاہدے کے مجموعی ماحول کو ملحوظ رکھتے ہوئے کر لیا جاتا ہے لیکن بنیادی ڈھانچے کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر بنیادی ڈھانچہ ہی بدل دیا جائے تو اسے معاہدہ کی تجدید سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ نیا معاہدہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح تجدید کا یہ عمل بھی ہے کہ ماضی کے مسلمہ علمی اور فقہی اصولوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے دائرے میں رہ کر مسائل و احکام کی زمانہ کی ضروریات کے تحت تعبیر و تشریح کی جاتی ہے۔ لیکن اگر ماضی کی مسلمہ علمی روایات اور متفقہ فقہی اصولوں سے انحراف کر کے اور ان کا لحاظ رکھے بغیر دین کے احکام و قوانین کی نئی تعبیر و تشریح کی جائے گی تو یہ "تجدید" نہیں ہو گی بلکہ "تجدد" کہلائے گی۔

انبیاء ورسلؑ کی عظیم الشان جدوجہد:

نبوت و رسالت کا جو سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوا وہ آپ ﷺ پر آکر ختم ہوا۔ اسی دوران سب انبیاء و رسل نے اپنے اپنے دور کی شریعت کی بنیاد پر اس دور کے انسانوں کی تعلیم، تربیت، تزکیہ نفس، سیاست اور اجتماعیت کے لئے عظیم الشان کردار ادا کرتے رہے۔ جب ایک نبی دنیا سے چلا جاتا تو دوسرا آنے والا نبی اس کی شریعت کو از سر نو

(۱) بہاری، ظفر الدین، (س۔ن)، حیات اعلیٰ حضرت، مکتبہ نبویہ، لاہور، ج۳، صفحہ ۱۲۴

بیان کر کے تجدید دین کے فریضہ کو بخوبی سر انجام دیتا۔ خاص طور پر امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ نے تمام شعبہ ہائے زندگی کی پوری جامعت کے ساتھ راہنمائی کی ہے۔

موجودہ دور میں شریعت اور طریقت کی تعلیمات سے عام طور پر لوگ کسی درجے میں تعارف رکھتے ہیں لیکن دین اسلام کی تعلیمات کی اساس پر سیاسی جدوجہد سے ناواقفیت ہمارے اہل علم میں بھی پائی جاتی ہے جبکہ سیاست کا تعلق ایک عملی زندگی سے ہے اور دین اسلام کا عملی نظام بغیر سیاسی جدوجہد کے قائم نہیں ہو سکتا۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء كلما هلك نبي خلفه نبي وإنه لا نبي بعدي وسيكون خلفاء فيكثرون"(۱)

"بنی اسرائیل میں انبیاء حکومتیں کیا کرتے تھے جب ایک کا وصال ہوتا تو دوسرا اس کا جانشین بنتا تھا، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے البتہ میرے خلفاء بہت ہوں گے"

اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی بعثت کے مقاصد میں ایک مقصد سیاسی جدوجہد بھی ہے، یہاں تک کہ ایک نبی کے دنیا سے جانے کے بعد دوسرا نبی ان کی خلافت کے طور پر سیاست کے اہم فریضہ کو سر انجام دینے کے لئے تشریف لاتے رہے، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا تو آپ ﷺ کے خلفا کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی تناظر میں خلفائے راشدین کی سیاسی جدوجہد اور ان کا حکومتی کردار ادا کرنا اہم دینی تقاضا سمجھا جاتا رہا ہے۔

تجدید دین کی وسعت:

قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾(۲)

الْمُشْرِكُونَ﴾(۲)

---

(۱)بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، (۱۹۸۷ء)، الصحیح، دار القلم، بیروت، لبنان۔۳/۱۲۷۳، رقم:۳۲۶۸

(۲)سورۃ الصف،۶۱/۹

"وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے اور سب دینوں پر غالب کرے، خواہ اس سے مشرکوں کو اس سے برا ہی لگے"

دین حق کا غلبہ دلیل نبوت ہے قول باری ہے "لیظھرہ علی الدین کلہ" تا کہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے۔

اگر دیکھا جائے تو اس کا شمار دلائل نبوت میں ہوتا ہے کیونکہ یہ بات اس وقت کہی گئی تھی جب مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، وہ بہت کمزور تھے اور انہیں ہر وقت دشمنوں کا خطرہ لاحق رہتا تھا اور لوگوں کی نظروں میں مقہور و بے بس تھے۔ لیکن ان حالات کے باوجود یہ خبر اپنی تمام جزئیات کے ساتھ حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ اس زمانے میں ادیان درج ذیل تھے۔ یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، صابئیت اور ان کے علاوہ بت پرست بھی تھے جن کا دائرہ، عرب سے لے کر سندھ یعنی ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا۔ پھر ان ادیان کو ماننے والوں میں سے کوئی قوم ایسی باقی نہیں رہی جس پر مسلمان غالب نہیں آئے اور ان کے تمام علاقوں یا بعض کو اپنے زیر نگیں نہیں کیا اور انہیں دور دراز علاقوں کی طرف مار بھگایا۔ یہ ہے اس آیت کا مصداق جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسلام کو ان تمام ادیان پر غالب کر دے گا۔ ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے اور وہ غیب کی خبر صرف اپنے رسولوں کو وحی کے ذریعے بھیجتا ہے۔ اس لئے یہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی صحت کی ایک واضح دلیل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان تمام ادیان پر غلبہ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ہوا تھا اس لئے یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غلبہ نہیں کہلا سکتا۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ آپ کے لائے ہوئے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے گا کیونکہ:

ارشاد باری ہے "ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ" وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے)

دین اسلام کی فوقیت و اختتامیت کے حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾(۱)

"آج میں نے مکمل کر دیا تمہارے لئے تمہارے دین کو، اور پورا کر دیا تم پر اپنے انعام کو، اور پسند کر لیا تمہارے لئے اسلام کو (ہمشہ کے) دین کے طور پر"

---

(۱) سورۃ المائدہ، ۵/۳

حدیث نبوی ﷺ ہے:

"الإسلام يعلو ولا يعلى"(۱)

"کہ اسلام غالب ہونے کے لئے آیا ہے مغلوب ہونے کے لئے نہیں۔"

مومن، زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے اور جو زمانے کے تقاضوں سے آگاہ نہ ہو اسے فقہاء جہالت مآب قرار دیتے ہیں۔

"من لم يعرف أحوال زمانه فهو جاهل"(۲)

"جو اپنے زمانے کے احوال سے آگاہ نہ ہو، وہ جاہل ہے"

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

"إن الله عزوجل يحدث للناس أقضيه يحسب زمانهم وأحوالهم"(۳)

"اللہ تعالیٰ لوگوں کے فیصلے ان کے زمانے اور احوال کے مطابق کرتا ہے"

ان مسائل کو لازمی حل کرنے میں غور و فکر کو دخل دینا پڑے گا۔ جس طرح فقہائے کرام نے اپنے اپنے زمانے کے مسائل حل کرنے میں دخل دیا تھا۔ اور اسی طرح طعن و تشنیع کو برداشت کرنا پڑے گا۔ جس طرح آئمہ کرام نے کیا تھا۔

مومن زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے، بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق انسانی ذہنیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے سلجھے ہوئے افکار و خیالات اور ر نظریات کا شعور دینا، شعوری طور پر افکار اور تعلیمات کے مطابق نئی سماجی تشکیل کے لئے حکمت عملی تشکیل دینا اور اس کے لئے جانی و مالی قربانی پیش کرنا عصر جدید میں انقلابی جدوجہد کہلاتا ہے اور یہ عمل انسانی معاشروں میں تبدیلی کی ایک نئی لہر پیدا کرتا ہے جو سوسائٹی کی سماجی تشکیل کو نئے اسلوب اور منہج پر ڈال دیتی ہے۔

---

(۱) سیوطی، جلال الدین، (س۔ن)، الجامع الصغیر فی احادیث البشیر النذیر، دار لفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت۔ رقم الحدیث ۲۷۷۸:

(۲) قاضی خان، حسن بن منصور، (س۔ن)، فتاوی قاضی خان فی مذھب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ ۱/۲۰۹

(۳) شعرانی، عبد الوھاب، (۱۹۲۵ء)، کتاب المیزان، مطبع الازہری، مصر۔ ج۱، ص۳۱

دین اسلام کی تعلیمات اور اسوۂ رسول ﷺ کا جائزہ لیا جائے تو وہ ہر ہر دور کے تقاضوں کے مطابق ہیں، آپ ﷺ کی ذات گرامی میں دیگر تمام پہلوؤں کی جامعیت کے ساتھ نمایاں ترین پہلو نئی سیاسی، سماجی اور معاشی تشکیل کے حوالے سے انقلابی جدوجہد کا ہے۔ قرآن حکیم کی شکل میں آپ ﷺ پر نازل ہونے والا پیغام الٰہی، بلاشبہ ایک انقلابی پیغام تھا۔ اسی کی تعلیمات کی روشنی میں آپ ﷺ نے ایک اولو العزم جماعت صحابہؓ بنا کر انسانیت میں ایک عالمگیر انقلاب کی داغ بیل ڈالی پھر آپ ﷺ کے بعد جماعت صحابہ کرامؓ کی عظیم الشان قربانیوں اور ان کی اجتماعی جدوجہد نے دین کے اس انقلابی پیغام کو پوری دنیا میں غالب کرنے کے لئے بڑا روشن کردار ادا کیا۔ خصوصاً خلفاء الراشدین جنہوں نے نئے منہج پر انسانی سماج کی تشکیل کے لئے انقلابی قوانین، سیاسی نظام حکومت، اقتصادی اور معاشی نظام قائم کیے اور رہتی دنیا تک نمونے کا معیار نظام زندگی قائم کر کے عالم دنیا پر آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ لازول نقوش ثبت کیے۔ اس کے بعد کئی ایک مجدد دین امت میں آتے رہے جنہوں نے تجدیدی کارنامے سرانجام دیئے اور امت کو حقیقی تعلیمات اسلام سے روشناس کرواتے رہے۔

مجدد دین امت:

انبیاء کرامؑ کے وارث تو علماء ربانیین ہوتے ہیں۔ یہی حضرات دین اسلام کے تمام شعبوں میں تجدید و انقلابی کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔ تقریباً ہر سو سال کے بعد تجدید و انقلاب کی اہمیت آپ ﷺ کے ارشاد سے واضح ہوتی ہے۔ ابو دائو د شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

''إن الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها''(۱)

اللہ ہر صدی کے سر پر اس امت کے لیے ایسے لوگ اٹھاتا رہے گا جو اس کے لیے اس کے دین کو تازہ کریں گے''

چنانچہ ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ ایسے علماء ربانیین کو بھیجتے رہے جو آپ ﷺ کے سچے خلفا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے شریعت کے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں تجدیدی اور انقلابی کردار ادا کیا۔ ان حضرات نے دور بدلنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے سامنے پیش آنے والے مسائل کے حل کے لئے شریعت کی تشریح و تفہیم اور انسانی روح کا تزکیہ اور تربیت کے بدلتے ہوئے طریقہ کار اور اجتماعی زندگی کے تمام تقاضوں کی راہنمائی کے لئے شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ایسے حضرات ہی مجدد دین یا آئمہ انقلاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

---

(۱) ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، (۱۹۹۴ء). السنن، تحقیق: شعیب الارنؤوط، دار الفکر، بیروت۔ ۴/۱۰۹، رقم: ۴۲۹۱

امام اور مجدد کی حقیقت بیان کرتے ہوئے مولانا قاسم نانوتوی تحریر فرماتے ہیں:

"معاشرے کی خرابی کے وقت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ کسی بندے کو مخصوص فرمالیتی ہے اور اسے روحانی امراض کی بصیرت اور تشخیص عطا فرماتی ہے۔ اس زمانے میں اس شخص کے پیچھے چلنے میں ہدایت منحصر ہو جاتی ہے جو شخص اس کے پیچھے لگ گیا، راہ ہدایت پر پڑ گیا ورنہ گمراہی کے گڑھوں میں گر کر ہلاکت سے دوچار ہو گا۔ ایسے شخص کو اس لحاظ سے کہ وہ اپنے زمانے کا پیش رو ہوتا ہے امام کہتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے کہ اس کے احکام زمانے کے امراض کے حکم کے مطابق پچھلے لوگوں کے احکامات سے بہ نسبت ایک گنائے اور جدید دکھائی دیتے ہیں اس کو مجدد کہتے ہیں" (۱)

علوم نبوت کے وارث ایسے حضرات آئمہ مجددین نے شریعت، طریقت اور سیاست کے میدان میں کئی مشکلات کو حل کرنے کے لئے ایک بڑی جدوجہد اور بڑی کوشش کی ہے۔ ہر خطے میں صحابہ کرام کے نقش قدم پر چلنے والے تبعین یعنی عدل و انصاف کرنے والے حکمرانوں، صوفیائے ربانیین اور شریعت کے علمائے محققین نے اپنے اپنے ممالک میں سماجی اور اجتماعی نظام حیات میں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خاص طور پر برصغیر میں اس خطے کی سیاسی، معاشی اور سماجی صورت گری میں ان حضرات کا کردار کسی سے پوشیدہ نہیں۔

چنانچہ امام ابو حنیفہؒ سے لے کر اب تک فقہائے کرام، محدثین عظام، آئمہ اہل بیت، چشتی، قادری، سہروردی اور نقشبندی سلسلہ کے بانیان و بزرگان نے تجدیدی اور انقلابی کردار ادا کرتے ہوئے نہ صرف شریعت کی تعلیمات کے پھیلاؤ تربیت اور تزکیے کا کام کیا، بلکہ ہر ایک نے اپنے اپنے دور کی سیاست کو درست راستے پر رکھنے کے لئے رہنمائی فرمائی۔ انہوں نے اس کے لئے ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز حق بلند کیا۔ یوں شریعت، طریقت اور سیاست کی جامعیت کی اساس پر دین اسلام کی تعلیمات کے فروغ اور اس کی تجدید کے لئے اہم انقلابی کردار ادا کیا اور انقلابی فکر و عمل کو واضح کیا۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ (م:۱۵۰ھ)

آپ ﷺ کی بعثت کے تقریباً سو سال بعد جب زمانہ ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ اس سو سالہ دور میں اسلام چہار دانگ عالم میں پھیلتا ہے اور عالمی قومیں دین اسلامی کی انقلابی تعلیمات کو قبول بھی کرتی ہیں۔ ایسے بین الاقوامی ماحول

(۱) نانوتوی، محمد قاسم، (س۔ن)، مکتوب بنام مولانا فکر الحسن، مترجم پروفیسر انور الحسن شیر کوٹی، خیابان پریس، اردو بازار، لاہور۔ ص۱۳۸

میں نئی عالمی سیاسی، اور سماجی تشکیل کے لئے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عالمی اصول و قوانین کو مدین کرنا اس زمانہ کا تقاضا بن جاتا ہے۔

تاریخ کے اس ادوار میں امام ابو حنیفہؒ نے زمانہ کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک نئی عالمی سماجی تشکیل کے لئے درج ذیل چند تجدیدی اصول متعین کئے:

۱۔ اجتماعیت کی اساس اور ادارتی بنیادوں پر قانون سازی کا طریقہ متعارف کرایا اس کے لئے انہوں نے سیاسی و سماجی لہروں کو سمجھنے والے ہر علم و فن کے ماہرین فقہا، مجتہدین ماہرین لسانیات اور ادبا کی ایک مجلس قائم کی۔ اس طرح باہمی مشاورت سے دین اسلام کی تعلیمات کے اصول وکلیات متعین فرمائے۔

۲۔ ان اصول وکلیات کی روشنی میں اپنے دور کے معروضی حقائق کے تناظر میں ذیلی اور فقہی قوانین پر مشتمل فروعی مسائل کی تخریج کی اور اس کے صحیح طریقے کی نشاندہی کی۔

۳۔ ان قوانین کی روشنی میں سماجی تشکیل کے سیاسی اور معاشی امور واضح کیے۔

۴۔ انہیں روبہ عمل لانے کے لئے حکومتی دباؤ سے آزاد اجتماعی جدوجہد کا انقلابی نظریہ پیش کیا۔

۵۔ اپنے دور میں آزادی انقلابی حکمت عملی کے تحت حکومتی عہدہ قبول کیے بغیر جانی و مالی قربانی پیش کی اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔(۱)

ہزارہ اول کے مجدد عمر بن عبد العزیز:

عمر بن عبد العزیز بن مروان بن حکم بن ابی العاص ۶۱ھ میں پیدا ہوئے، آپ کی والدہ ماجدہ ام عاصم لیلیٰ بنت عاصم بن عمر بن خطاب تھیں۔ آپؒ کا شمار جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے۔

علامہ شمس الدین الذھبیؒ فرماتے ہیں کہ بقول امام شافعیؒ خلفاء راشدین پانچ ہیں۔

"ابو بکر، عمر فاروق، عثمان غنی، علی المرتضی رضی اللہ عنھم اور عمر بن عبد العزیزؒ ہیں۔ مجاہد کہتے ہیں کہ ہم عمر بن عبد العزیز کو پڑھانے گئے مگر خود الٹا ان سے پڑھنے لگے"(۲)

---

(۱) ایضاً، ص ۸۷

(۲) ذھبی، شمس الدین، (۱۹۸۱ء)، تذکرۃ الحفاظ، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور۔ ص ۱۱۱

"آپ کا دور خلافت راشدہ کے احیاء، اسلامی تہذیب وثقافت، قرآن وسنت کے نفاذ اور اسلامی علوم کی نشاۃ ثانیہ کا دور کہلاتا ہے۔ امام سفیان ثوری فرماتے ہیں خلفاء راشدین پانچ ہیں اور پانچواں خلیفہ راشد عمر بن عبد العزیزؒ ہے"(۱)

بقول مولانا ابو الحسن ندوی حضرت عمر بن عبد العزیز کا قول ہے:

"محمد ﷺ دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیلدار نہیں، اس لئے آپ نے دینی نفع کے مقابلہ میں حکومت کے مالی نقصان کی کبھی پروا نہیں کی۔ آپ کے چند تجدیدی کام درج ذیل ہیں

۱۔ لوگوں کے اعمال واخلاق کی اصلاح
۲۔ تبلیغ واشاعت دین
۳۔ تدوین حدیث واحیاعلوم الدین
۴ خاتمہ بدعات ونفاذ دین
۵۔ بیت المال اور اس کے مصارف کی اصلاح
۶۔ ذمیوں کے حقوق کی حفاظت
۷۔ ناجائز ٹیکسوں کا خاتمہ
۸۔ بنی ہاشم کے حقوق کی بحالی وتبرا کا خاتمہ
۹۔ جیل خانوں کی اصلاح
۱۰۔ رعایا کی فلاح وبہبود کے لئے جدوجہد (۲)

ہزارہ دوم کے مجدد شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانیؒ):

ابو البرکات بدر الدین، شیخ احمد نقشبندی سرہندی ۹۷۱ھ سرہند میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام مخدوم شیخ عبد الاحد چشتی تھا۔ آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۶۴۵ ہے۔ جب اکبر بادشاہ کی بے جا مداخلت اسلام اور من مانی کے بنائے ہوئے اسلام کا دور دورہ تھا، مسجدیں گرا کر مندر تعمیر کروائے جارہے تھے تو اس وقت مجدد الف ثانیؒ نے مسلمان قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا

---

(۱) سوہدری، کامران اعظم، (۲۰۱۲ء)، حضرت عمر بن عبد العزیز، جہلم بک کارنر، پاکستان۔ ص ۶۴

(۲) ندوی، ابو الحسن علی، (۱۹۶۹ء)، تاریخ دعوت وعزیمت، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ ص ۳۷

بقول شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ آپ کے شیخ طریقت خواجہ محمد باقی باللہ نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ:
"سرہند میں بہت بڑے عالم شیخ احمد نے چند روز میرے پاس نشست و برخاست کی جس میں میں نے آپ کے عجیب و غریب حالات دیکھے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ عنقریب ایسا روشن آفتاب ہو کر چمکیں گے جس سے ساری دنیا جگمگا اٹھے گی"(۱)

شیخ احمد سرہندی مکتوبات میں خود تحریر فرماتے ہیں کہ:
"میری پیدائش سے جو مقصود مجھے معلوم ہوا ہے وہ پورا ہو گیا ہے اور ہزار سالہ تجدید کی دعا مقبول ہو گئی ہے اللہ نے مجھے دو سمندروں یعنی علماء اور صوفیاء کے درمیان واسطہ، سلہ اور صلح کروانے والا بنایا"(۲)

مجدد صاحب کے مقصد کو واضح کرتے ہوئے اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں:
"مجدد الف ثانی کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی تعلیمات کو ہندو مت کے اشتراک سے روکیں اور انہیں محض وحدۃ الوجود تعلیمات نہ بننے دیں اور آپ کا مجدد ہونا اس فلسفہ کے رد پر تھا۔ آپ کی دیگر تعلیمات انقلابی نوعیت کی نہ تھیں آپ کے مرید بادشاہ کے لشکر اور شاہی افواج میں کام کرتے تھے۔ مجدد صاحب کے اثرات ان کی وفات کے بعد اس لئے جاری رہے کہ انہوں نے ایسے بہت سے کارکن اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی جیسے علماء تیار کر دیے تھے جنہوں نے اسلام کا بہتر فہم پیدا کرنے میں اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔"(۳)

قلعہ گوالیار کی قید کے بعد بالآخر جہانگیر شرمندہ ہوا اور آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی مجدد صاحب نے درج ذیل شرائط پیش کیں، جن کو مجدد صاحب کے تجدیدی کام سے موسوم کیا جاتا ہے:

۱۔ سجدہ تعظیمی موقوف کیا جائے۔
۲۔ منہدم شدہ مساجد از سر نو تعمیر کی جائیں۔
۳۔ ذبیحہ کا حکم امتناعی منسوخ کیا جائے۔
۴۔ شریعت کے نفاذ کے لئے قاضی، مفتی اور محتسب مقرر کئے جائیں۔
۵۔ جزیہ جاری کیا جائے۔

---

(۱) دہلوی، عبد الحق، (۱۴۱۸ھ)، اخبار الاخیار، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ص ۲۹۷
(۲) سرہندی، شیخ احمد، (۲۰۰۷ء)، مکتوبات امام ربانی، شبیر برادر، لاہور۔ ص ۳۸
(۳) قریشی، اشتیاق حسین، (۱۹۹۹ء)، پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی۔ ص ۲۰۳

۶۔ بدعات کا خاتمہ کیا جائے۔

۷۔ اس موجودہ تنازع کے تمام محبوس قیدی رہا کئے جائیں۔(۱)

تجدید دین کے متعلق علامہ اقبال کا نقطہ نظر:

قانون کے ارتقاء کے متعلق ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:

"کیا قانون اسلام میں ارتقا کی گنجائش رکھی گئی ہے؟ جواب اثبات میں ہو گا مگر شرط ہے کہ قانون کو حضرت عمرؓ کی آنکھ سے دیکھا جائے وہ اسلام کے پہلے تنقیدی اور آزاد ذہن تھے جب ہم اسلام کے مختلف مکاتب فکر اور چاروں متفقہ ماخذ قانون کا مطالعہ کرتے ہیں تو کسی ایک تسلیم شدہ مکتب فکر کے سلسلے میں ہماری سخت گیری ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس میں ارتقاء کا امکان مکمل طور پر واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔"(۲)

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے متعلق علامہ اقبال نے ایک اسلامی ملک کی قومی اسمبلی میں علما کا کردار کو یوں واضح کیا ہے:

"Most of the modern assembly possessing no knowledge of Muhammadan Law .Such an assembly may make great mistakes in their interpretation of law .A ecclesiastical committee of Ulema should from a vital part of Muslim legislative assembly helping and guiding discussion on questions relating to law" (3)

"آجکل کی جدید اسمبلی میں ہو سکتا ہے کہ اکثر ممبران شریعت اسلامیہ یعنی فقہ اسلامی کا علم نہ رکھتے ہوں، ایسی اسمبلی قانون کی تشریح میں بڑی بڑی غلطیوں کی مرتکب ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں علماء کی ایک مشاورتی کمیٹی بنانی چاہیے اور یہ اسلامی قانون سے متعلق اٹھنے والے سوالات کے حوالے سے ایک مسلم اسمبلی میں بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہے اور قانونی مدد اور رہنمائی کر سکتی ہے۔"

تجدید مذہب کے متعلق ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:

---

(۱) مجددی، محمد اقبال، (۲۰۱۲ء)، تذکرہ علماء و مشائخ پاک و ہند، لاہور۔ ص ۱۴۔۱۵

(۲) احمد، شہزاد، (س۔ن)، اسلامی فکر کی نئی تشکیل، علم عرفان پبلیشرز، لاہور۔ ص ۱۹۳۔۱۹۴

(3) Sheikh ,Muhammad Saud, (2001), The reconstruction of religious thought, Institute of Islamic culture, Lahore. P:139

"اسلام میں ایسے ابدی اصول جو تغیر پذیر دنیا میں نہیں بدلتے اس سے ہمارے قدم جمے رہتے ہیں مگر تغیر کے سارے امکانات ختم کرنے سے ہم متحرک شے کو غیر متحرک بنا دیتے ہیں۔ گذشتہ پانچ سو سالوں سے اسلام کی غیر حرکت پذیری اسی سبب سے ہے اور اسی اصول کو اجتہاد کہتے ہیں۔ اسلامی قوانین کو فکر جدید اور تجربے کی روشنی میں از سر نو تعمیر کرنا ناگزیر ہے اس تصور کی بنیاد خود قرآن ہے کہ جو ہماری طرف کوشش کریں گے ہم ان کو راستہ خود دکھائیں گے۔ اگر اسلام کی نشاۃ ثانیہ ایک حقیقت ہے تو ہمیں ترکوں کی طرح اپنے فکری ورثہ کی قدر از سر نو متعین کرنی چاہیے۔ ہمیں اپنی صحت مند قدامت پسندانہ تنقید کے ذریعے اتنی تو خدمت کرنی چاہیے کہ عالم اسلام میں تیزی سے پھیلتی ہوئی آزاد پسندی (لبرلازم) کی تحریک کو روک سکیں"(۱)

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک تغیر ایک مسلسل عمل ہے جس کو مثبت انداز میں جاری وساری رہنا چاہیے اور اسلام میں سکون وثبات اور تغیر وتنوع میں باہمی موافقت ضرور رہنی چاہیے۔

محدودیت تجدید دین:

اسلام جدت کو پسند کرتا ہے، جدید پیش آنے والے انکشافات کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے اور جدید مسائل کے شرعی حل کے لئے اقدامات کو انتہائی ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ اسلامی شریعت کے ذریعے سے اجتہاد کرنے والا اجر کا مستحق قرار پاتا ہے۔ جدید مسائل پر غور کرنے اور اس کا حل پیش کرنے کی کوشش کو محمود اور قابل ثواب قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول تھے، اب نہ ہی کسی نبی ورسل نے آنا ہے اور نہ ہی کسی شریعت نے، لہذا قرآن وسنت کی نصوص کی روشنی میں جدید اور نو پیش آمدہ مسائل کے حل کے بارے میں فیصلے آسانی سے کیے جاسکتے ہیں۔

لہذا یہ بات درست ہے کہ ہر نئی بات اور نئے کام کو بدعت اور گمراہی سمجھنا غلط ہے، آپ ﷺ کے فرمان کی روشنی میں صرف وہ نیا کام بدعت وگمراہی ہے جس کی اصل ہی دین میں نہ ہو۔ ہر وہ نئی بات جس کی اصل قرآن وسنت میں نہ ہو وہ قابل رد ہے۔ البتہ وہ امور جائز ہیں جو قرآن وسنت کے مطابق ہوں یا جن کی اصل قرآن وسنت میں موجود ہو۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ومالک ہے اس نے ہر ایک چیز کو تخلیق کیا ہے اور اسی نے ہی ہر ایک کو اپنے مقاصد کی حدود میں پابند کیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

(۱) عشرت، وحید، (۲۰۰۲ء)، تجدید فکریات اسلام، اقبال اکادمی، لاہور۔ ص ۱۸۱

﴿لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ﴾(۱)

"نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑے اور نہ ہی رات سبقت لے جاسکتی ہے دن پر ہر ایک تیرے جارہا ہے اپنے مستقل دائرے میں"

اللہ تعالیٰ نے مومن کی حد بھی بیان کر دی کہ وہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی حدوں میں رہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا﴾(۲)

"اور روا نہیں کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لئے جب کہ فیصلہ فرمادے اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں یہ بات کہ ان کو اس کے بعد بھی اختیار حاصل رہے اپنے اس معاملے میں اور جس نے نافرمانی کی اللہ اور اس کے رسول کی تو یقیناً (اس نے اپنا ہی نقصان کیا کہ یقینی طور پر) وہ پڑ گیا کھلی گمراہی میں"

اسی طرح انسان بھی پابند ہے کہ وہ ان حدود اور دائرہ کار میں رہے تو کامیاب ورنہ ناکام کہلاتا ہے۔ گویا کہ تجدید دین کے لئے کام کرنے کی بھی کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ؐ نے ایک ترتیب بتائی ہے اس دائرہ کار میں رہ کر اگر کام کیا جائے تو تجدیدی عمل کہلائے گا ورنہ تجدد کے زمرے میں جائیگا۔ تجدید قابل داد ہے اور تجدد قابل مذمت۔

مولانا حفظ الرحمن سوہاروی فرماتے ہیں:

"انسان اپنی فکر کو یوں ہی نہ چھوڑے کہ جس وادی میں جس میدان میں چاہے آوارہ گردی کرے، کیونکہ فکر انسانی اگر برائیوں اور بدیوں کے گرد و پیش چکر لگاتی رہے گی تو وہ ایک دن ان میں ضرور گرفتار ہو جائے گی"(۳)

"ضبط نفس سے صحت کی حفاظت اور عقل کو توانیت نصیب ہوتی ہے اور نتیجہ میں انسان سعادت و آزادی سے شادکام ہو جاتا ہے۔"(۴)

---

(۱) سورۃ یسین، ۳۶/ ۴۰

(۲) سورۃ الاحزاب، ۳۶/ ۳۳

(۳) سیوہاروی، حفظ الرحمن، (۱۹۵۰ء)، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، دہلی۔ ص ۴۲۰

(۴) سیوہاروی، حفظ الرحمن، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، ص ۴۲۱

تجدید دین کا منہج اور حدود:

تجدید دین کا منہج اور حدود کیا ہونی چاہییں ؟اسی ضمن میں مولانا قاری طیب فرماتے ہیں:

"فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے سلسلہ میں سب سے پہلا قدم جو ہمیں اٹھانا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے فکر کا ایک نشانہ اور ہدف متعین کر لینا چاہیے جس پر ہم اپنے فکر کی توانیاں صرف کریں اور شاخ در شاخ مسائل اس نقطے سے جوڑتے چلے جائیں۔ جس سے نہ صرف راستہ ہی سامنے آجائے گا بلکہ تشتت افزا ادہام وخیالات بھی خود بخود اس سے رفع ہوتے چلے جائیں گے۔ اور ہمارا قدم بجائے منفی ہونے کے مثبت انداز سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ سو ہمارے نزدیک وہ جامع نقطہ ایک ہی ہے، جس کا نام منہاج نبوت ہے جس پر فکر کو مرکوز کر دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس منہاج ہی کی شمع ہاتھ میں لے کر یہ قوم آگے بڑھتی ہے۔ پس اس منہاج سے آج بھی آگے بڑھ سکتی ہے"[1]

تجدید دین کے سلسلے میں دوسرا قدم وہ اصول اور قواعد کلیہ اور ضوابط ہیں جن کے نیچے منہاج نبوۃ کے تمام عقائد و احکام واخلاقی عبادات اور معاملات واجتماعیت وغیرہ آئی تھی۔ اور اس طرح قدیم وجدید تشکیل میں کوئی تفاوت یا بعد اور بیگانگی رونما نہ ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اصول کلیہ سے ہٹ کر یا انہیں بدل کر یہ تشکیل اسلامی فکر کی تشکیل نہ بن سکے گی، البتہ ان قواعد کلیہ میں جو ضوابط عبادت اور عقائد کے بارے میں ہیں، ان کی عملی جزئیات بھی شریعت نے خود متعین کر دی ہیں، اس لئے ان میں تغیر و تبدل یا کسی جدید تشکیل کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ البتہ معاملاتی، معاشرتی اور سیاسی واجتماعی امور میں چونکہ قواعد کلیہ کے تحت رکھا گیا ہے، اس لئے ان میں بہر حال فنی استخراج کی ضرورت پڑے گی جسے مبصر علماء کی بصیرت ہی حل کر سکے گی۔ جیسا کہ قرون ماضیہ میں کرتی رہی ہے۔ پس ایک مسلم کو اجتہاد کی تو اجازت ہے ایجاد کی نہیں ہے کہ وہ اتباع کے دائرے سے باہر نکل سکے۔[2]

ڈاکٹر محمد امین تجدید کی حدود کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ بات درست ہے کہ بعض لوگ غلط فہمی سے ہر نئی بات اور نئے کام کو بدعت اور گمراہی سمجھتے ہیں، جبکہ آپ ﷺ کے فرمان کی روشنی میں صرف وہ نیا کام بدعت و گمراہی ہے جس کی اصل ہی دین میں نہ ہو۔ ہر وہ نئی بات

---

(۱) محمد طیب، قاری، (۱۹۷۸ء)، کلمات طیب فکر اسلامی کی تشکیل جدید، (مجموعہ مقالات) مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔ ص ۴۰

(۲) محمد طیب، قاری، کلمات طیب فکر اسلامی کی تشکیل جدید، ص ۴۳۔۴۴

جس کی اصل قرآن و سنت میں نہ ہو وہ قابل رد ہے۔ تاہم وہ نئے امور جائز ہیں جو قرآن و سنت کے مطابق ہوں یا جن کی اصل قرآن و سنت میں موجود ہوں۔"[1]

گویا کہ ہر وہ تجدیدی کام جو درج ذیل حدود میں ہو تو جائز ہے:

۱۔ جو نصوص قرآن و سنت کے مطابق ہو

۲۔ یا کسی نص کے خلاف نہ ہو

۳۔ جو نصوص سے قیاساً یا دلالتاً مستنبط ہوتا ہو

۴۔ جو ان مقاصد کو پورا کرتا ہو جن کی تائید نصوص کرتی ہیں (مثلاً عدل، یسر وغیرہ)

۵۔ جو ان مصالح پر مبنی ہو جن کی تائید شرعی نصوص کرتی ہو جیسے حفظ جان، حفظ دین، حفظ مال

۶۔ جو مقاصد شریعت کے مطابق ہو اور مصالحہ مرسلہ پر مبنی ہو (یعنی نصوص نفیًا یا اثباتاً اس کے بارے میں خاموش ہوں) اور ایسا عموماً ان امور دنیا میں ہوتا ہے جن کا تعلق انسانی عقل و تجربے سے ہو اور وحی بر بنائے حکمت و رحمت ان سے تعرض نہیں کرتی۔ مثلاً کھیتی باڑی کیسے کی جائے؟ لوگ اپنی عقل و تجربے سے جس عرف اور رسم و رواج اور طریقے کار کو اپنا لیں وہ انہیں قبول کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم بعض چیزیں عرف پر چھوڑتا ہے اور رسول اکرم ﷺ کا طریق مبارک بھی یہی تھا کہ جو عرف خلاف شریعت ہوتا اسے رد کر دیتے اور جو ایسا نہ ہوتا اسے بحال رکھتے۔ جیسا کہ کھجوروں کے پیوند والے معاملے میں فرمایا تم لوگ اس دنیوی امور کو خود بہتر سمجھتے ہو۔

ہمارے فقہا اور اصولیین نے اس عظیم قاعدے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جدید امور کی قبولیت کا ایک وسیع دائرہ، شریعت اسلامیہ میں موجود ہے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ خلفائے راشدین نے بڑی وسعت سے جدید کاموں میں نئے فیصلے کیے۔ مثلاً:

۱۔ حضرت ابو بکرؓ نے قرآن حکیم کو ایک صحیفے پر جمع کیا اور زکوۃ نہ دینے والوں کے خلاف جہاد کیا۔

۲۔ حضرت عمرؓ نے امت کو بیس تراویح پر جمع کیا، شراب نوشی کی سزا اسی کوڑے مقرر کی۔

۳۔ حضرت عثمان غنی نے جمعہ میں دوسری اذان کا حکم دیا

۴۔ حضرت علیؓ نے دعویٰ اسلام کے باوجود خوارج سے جنگ کی۔

خلفائے راشدین کے اسوہ حسنہ کی بدولت فقہاء کرام، آئمہ حضرات نے نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لئے نہایت ہی بہادری کے ساتھ فیصلے کیے۔

---

(۱) محمد امین، ڈاکٹر، (۲۰۱۴ء)، عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور، پورب اکیڈمی، اسلام آباد۔ ص ۶۲۔۶۳

تجدید اور تجدد کے فرق کو سمجھنے کے لیے اکبر بادشاہ اور اورنگزیب عالمگیرؒ کی ان کاوشوں کا تقابلی مطالعہ کرلینا کافی ہے۔ یہ پردادا اور پڑپوتا دونوں اپنے اپنے وقت کے عظیم حکمران تھے اور دونوں کی ''روایات'' کا تسلسل اب تک جاری ہے بلکہ اب تو زیادہ ہی نمایاں ہوتا جارہا ہے۔ البتہ امت کا سواد اعظم چونکہ قرآن کریم، سنت رسولؐ، صحابہ کرامؓ، فقہائے عظامؒ اور اولیائے امتؒ کے ساتھ جذباتی اور فکری دونوں حوالوں سے بے لچک وابستگی رکھتا ہے اس لیے ماضی کی طرح اب بھی ''تجدد'' کے کسی عمل کا امت میں قبول عام حاصل کرنے کا سرے سے کوئی امکان نہیں ہے۔

دینی کام کو اگر چار بنیادی شعبوں میں (۱۔ علم العقائد، ۲۔ علم الفقہ، ۳۔ علم التزکیہ والاحسان، ۴۔ علم السیاست و الحکومت) تقسیم کیا جائے تو مجددین کی تین اقسام بنیں گی۔ بعض مجدد صرف کسی ایک شعبہ زندگی میں تجدید کرتے ہیں جیسا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ حکومت وخلافت میں، فقہاء اربعہ نے فقہ میں اس قسم کے مجددین ہمہ پہلو شخصیت رکھتے تھے مگر انکا تخصص کسی ایک شعبہ دین میں تھا۔ مجددین کی دوسری قسم وہ ہے جو مذکورہ بالا شعبوں میں سے کسی دو میں تجدید کرتے ہیں۔ مجددین کی تیسری قسم میں وہ مجددین ہیں جو ہمہ جہت دین کی تجدید کرتے ہیں۔ وہ عقائد، فقہ، تصوف اور سیاست وحکومت کے تمام شعبوں میں اصلاح وتجدید کرتے ہیں اور ایک نئی روح کے ساتھ پورے دین کو پھر قابل عمل اور حسین وجمیل بنا کر پیش کرتے ہیں جیسے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی آپ عالم اسلام کے وہ عظیم مجدد ہیں جن کی تجدیدی کاوشیں ہمہ جہت نوعیت کی تھیں اور ہر شعبہ زندگی میں دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

سفارشات وتجاویز:

۱۔ مجدد، اسلام کے لئے رائے عامہ کی ہمواری کا عمل اس طور پر انجام دے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی احکام کے نفاذ کا مطالبہ عوام کی جانب سے شد و مد کے ساتھ ہونے لگے۔ عوام اسلام کی فتح و نصرت کے لئے بے چین ہوں اور وہ اسی میں اپنی آخرت کی بھلائی سمجھتے ہوں۔

۲۔ ایک مجدد وقت کو اس کے اپنے ماحول کی صحیح تشخیص اور حالات وواقعات سے آگاہی ہو وہ مرضِ ملت سے واقفیت کے بعد ہی اس کا مداوا کر سکتا ہے۔

۳۔ ضرورت ہے ایسے شخص کی جو ایسے افراد پر مشتمل لوگوں کی جماعتیں تشکیل دے جو لوگوں کی صحیح نہج پر علمی راہنمائی فراہم کر سکیں اور ان میں موجود عقیدے اور روحانی خرابیوں کا علاج کر سکیں۔

۴۔ مجدد وقت اجتہاد کی اس کی شرطوں اور ضابطوں کی روشنی میں تجدید کرے تاکہ ایسے افراد تیار کئے جائیں جو قدیم رائے کے تعصب اور نئی سوچ کی غلامی سے آزاد ہو کر جزئی نصوص اور کلی شریعت کے مقاصد میں موافقت پیدا

کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ المختصر یہ کہ مجدد ایسا گروہ تیار کرے جو ماضی سے فائدہ اٹھائے، حال پر نظر رکھے اور مستقبل کی صحیح نہج پر راہنمائی کرے۔ اس گروہ کے افراد مضبوط ایمان، گہری فکر اور اتحاد و اتفاق بدرجہ اتم موجود ہو۔

۵۔ دفاعی جدوجہد یعنی اسلام کو مٹانے اور دبانے والی سیاسی یورشوں کا مقابلہ کیا جائے اور اس کی قوت کو توڑ کر اسلام کے لئے نفاذ کا راستہ پیدا کرنے کی سعی کی جائے۔

خلاصہ بحث

مرور زمانہ کے ساتھ مذہب کے ماننے والے کئی طرح کی غیر مذہبی روایات کو تسلیم کر لیتے ہیں اور مذہب کی حقیقی روح کھو بیٹھتے ہیں۔ گزشتہ مذاہب کی تجدید کے لئے انبیاء کرام تشریف لاتے اور لوگوں کے اخلاق و اعمال کی تطہیر کر دیتے تھے جبکہ مذہب اسلام میں ختم نبوت کے عقیدہ کی رو سے نیا نبی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہذا مذہب اسلام کی تجدید اور تطہیر کے لیے مجدد کا تصور دیا گیا جو اسلام کو اس کی اپنی اصل حاصل میں لے جاتا ہے گذشتہ صدیوں میں کئی مجددین نے تجدیدی کام کیے اور ان کے تجدیدی کام کی نوعیت اور طریقہ کار مختلف رہے جو جن حالات سے نبرد آزما ہوتا اسی طرح کا انداز اختیار کیا جاتا، جبکہ سترہویں صدی عیسوی تاحال امت مسلمہ میں علمی و فکری زوال اپنی منتہا کے اعتبار سے سیاسی زوال پر منتج ہوا، اس کے برعکس اہل یورپ نے علم و عمل کی راہ اختیار کی جو ان کی عالمی بالادستی کا سبب بنی، بیسویں صدی میں امت کا شیرازہ بکھیر کر انہیں منقسم کر دیا گیا اور نو آبادیاتی دور کی ابتداء ہوئی، ہندوستان میں اکبر کے دین الٰہی کے خلاف شیخ احمد سرہندی نے بھرپور طریقے سے تجدیدی کام کیا اور تباہ ہوتے مغلیہ اقتدار کو شاہ ولی اللہ نے سہارا دیا اور اسلام کو جدید روایات سے ہم آہنگ کیا اس کے بعد کے محققین نے وقتاً فوقتاً تجدید دین کی کوششیں کیں، جن کی کوششوں کے نتیجہ میں بیسویں صدی میں اسلام کے عملی نفاذ کے لئے تجدیدی تحریکیں مختلف انداز میں کام کر رہی ہیں۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر وھبہ زحیلی کی علمی خدمات

(عصر حاضر میں ان سے استفادہ کی اہمیت و ضرورت)

☆ احمد رضا

☆☆ ڈاکٹر غلام حسین

☆☆☆ سید مبشر حسین کاظمی

ABSTRACT

Dr. Professor Shaykh Wahbah Al-Zuhayli (1932-) born in Syria and Qualified from Azhar and various other Universities in Egypt and Syria is a prominent Sunni professor and Islamic scholar specializing in Islamic law and legal philosophy. He is the author of many of books on Islamic and secular law, many of which have been translated to English. He was chairman of Islamic jurisprudence in the College of Sharia at Damascus University. He is also a signatory to the Amman Message and A Common Word documents.

Key words: Zuhayli, Importance, Benefit, Islamic

گردش لیل و نہار کے ساتھ ساتھ حیات انسانی کے بدلتے رنگوں میں اجتہاد و تجدید مسائل کا عمل دخل ایک حقیقت ہے جس سے کسی بھی محقق کو انکار نہیں۔ جدید علمی، فکری اور تہذیبی ترقی کے دور میں نئے پیش آمدہ مسائل کا قرآن و سنت کی روشنی میں حل نکالنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں اس کے لئے اللہ رب العزت نے ہر زمانے میں کچھ ایسے نابغہ روزگار شخصیات پیدا فرمائے جنہوں نے جدید مسائل میں اجتہاد کر کے دین یقین کے یسر کے پہلو کو نمایاں کر کے امت کے لئے آسانی پیدا کی۔

سورۃ النحل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾

☆ ایم۔فل اسلامک سٹڈیز، منہاج یونیورسٹی، لاہور

☆☆ ایلیمنٹری سکول ٹیچر، دلہکے مہار، بصیر پور (اوکاڑہ)

☆☆☆ لیکچرار یونیورسٹی آف لاہور

اس آیت کریمہ میں مسائل کے حل کے لئے صاحبان علم کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہے۔ احادیث نبوی سے بھی ہر صدی میں کم از کم ایک مجدد عالم دین کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ اللهَ يَبْعَثُ لِهَذه الْأُمَّةِ عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا.

اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی کے سرے پر ایک ایسے شخص کو بھیجے گا جو اس امت کے لیے اس کے دین کی تجدید کردیا کرے گا۔(۲)

اس سے مراد ہر زمانے میں ایسے مجدد کا موجود ہونا ہے جو اجتہاد کے طریق پر مضبوط دلائل کے ساتھ جدید مسائل میں لوگوں کی رہنمائی کر کے ان کی اصلاح کرے۔

محترم ڈاکٹر وھبہ الزحیلی کے جدید فقہی مسائل میں ان کے اجتہادات کا تحقیقی جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وھبہ الزحیلی ایک عظیم علمی شخصیت کے مالک تھے، وہ ایک بالغ نظر محقق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے علمی و تحقیقی خصوصیات عطا فرمائے تھے جن کی وجہ سے آپ کا علمی قد اپنے ہم عصروں کے درمیان ممتاز اور نمایاں نظر آتا ہے۔

ا۔ڈاکٹر وھبہ زحیلی کی گراں قدر تالیفات

ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے بلاشبہ منفرد اسلوب کے مؤلف تھے، جو عصری تقاضوں کے مطابق مسائل کو مسلمانوں کے فائدے کے لئے بیان کرتے تھے۔ ان کا اسلوب تحریر شگفتگی، شائستگی، سنجیدگی، برجستگی، سادگی اور سلاست کا شاہکار نمونہ تھا۔ آپ اسلام اور مسلمانوں کے لئے بڑے متفکر رہتے تھے لیکن کبھی مایوس نہیں ہوئے، ہمیشہ کہتے تھے کہ آئندہ زمانوں میں مستقبل اسلام کا ہوگا۔ آج ہمارے درمیان آپ موجود نہیں لیکن ان کی شاہکار علم کے انمول موتی آج بھی ہرسو علم کا نور پھلائے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر وھبہ زحیلی کو تحریر کی وافر صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ وہ اس میں بہترین تسلی اور سکون محسوس کرتے تھے۔ وہ طویل مدت تک لکھتے رہے۔ بعض اوقات انہیں خیال گزرا کہ وہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ روک دیں۔ انکا اپنا بیان ہے:

وحينما بدأت أعوام الستينيات من عمري، حدثتني نفسي بالكف عن التأليف، وبدء رحلة سمو الروح، والعناية بالأذكار، والاستعداد للرحيل عن هذا العالم المعاصر، الذي أقبل فيه الناس على المادة والعناية بها أكثر من العناية بشؤون الدين، لميلهم إلى الترف واللهو،

والتأثر بتيارات الحضارة الغربية وموجاتها، التي تغلغلت في زوايا الحياء الإسلامية فعكرتها و أفسدتها، ولكن وجدت خير سلوة، وأجلى عبادة روحانية، إنما في الاشتغال بالعلم والفقه، لأنهما طريق العبادة الصحيحة، وسبيل الظفر برضوان الله تعالى-

جب میں ۶۰ سال کا ہوا تو میں نے دل میں سوچا میں مزید تالیفات سے رک جاؤں اور روح کی بلندی کا سفر شروع کروں کچھ اذکار شروع کروں اور اس دنیا سے اگلے سفر کی تیاری کروں۔ میں دینی معاملات کی طرف اکثر لوگ عیش و عشرت کی طرف رجحان کی وجہ سے توجہ نہیں دیتے۔ مغربی ثقافت کے فکری دھارے نے اسلامی طرز حیات کی طرف توجہ کی بجائے لوگوں کے عادات و معمولات کو بگاڑ دیا ہے۔ لیکن معاً میں نے سکون محسوس کیا اور روحانی عبادت کی تجلی کو علم اور فقہ میں مشغولیت میں پایا کیونکہ علم او فقہ عبادت صحیحہ کا راستہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور نجات کی سبیل ہے۔(۳)

ڈاکٹر وھبہ زحیلی کے نزدیک تصنیف و تالیف میں مشغول رہنا دین اور دنیا کا فائدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرائض کی ادائیگی کے بعد اہم عبادات میں انکا شمار ہوتا اور علماء نے بیان کیا ہے کہ وہ نفع جس سے عام لوگوں کو بھی فائدہ پہنچے وہ ذاتی نفع سے بہتر ہے۔

انکی تصنیف و تالیف کے حوالے سے ڈاکٹر اللحام لکھتے ہیں۔

بأنه من أغزر المعاصرين الذين نعرفهم تليفا و أكثرهم إنتاجا ويحلو لي أن أشبهه من هذه الزواية بجلال الدين السيوطي، الذي كان من أغزر علماء العصر المملوكي تأليفا و أوسعهم اطلاعاً على نتاج السابقين، مما أتاح له أن يضع المؤلفات الموسوعية المستوعبة إلى جانب الرسائل الصغيرة التي تعد بمثابة بحث علمي تخصصي-

ڈاکٹر وھبہ زحیلی اپنے معاصرین سے بڑھ کر زرخیز ذہن کے مالک تھے۔ اور میں جائز سمجھتا ہوں کہ تصنیف و تالیف کے اعتبار سے انہیں امام جلال الدین سیوطیؒ کے ساتھ تشبیہہ دوں جو اپنے زمانے میں سابقہ تمام لوگوں سے زیادہ کتابیں تالیف کرنے والے تھے۔ دینی و عصری علوم میں گہری واقفیت اور اچھی دسترس کی وجہ سے آپ ایک عظیم مفکر اور محقق تھے۔ (۴)

آپ کی تصانیف کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے۔ان کی بعض اہم تصانیف درج ذیل ہیں: (۵)

۱۔ آثار الحرب في الفقه الإسلامي

۲۔ الفقه الإسلامي وأدلته

۳۔ التفسير المنير

۴۔ الفقه الإسلامي في أسلوبه الجديد

۵۔ نظرية الضرورة الشرعية

۶۔ نظرية الضمان

۷۔ أصول الفقه الإسلامي

۸۔ الذرائع في السياسة الشرعية

۹۔ العلاقات الدولية في الإسلامي

۱۰۔ جهود تقنين الفقه الإسلامي

۱۱۔ شرعة حقوق الإنسان في الإسلام

۱۲۔ الفقه الحنبلي الميسر

۱۳۔ العقود المسماة في قانون المعاملات المدنية الإماراتي

۱۴۔ الأصول العامة لوحدة الدين الحق

۱۵۔ القرآن الكريم (بنيته التشريعية وخصائصه الحضارية)

۱۶۔ القصة القرآنية

۱۷۔ تخريج أحاديث تحفة الفقهاء للسمرقندي

۱۸۔ النصوص الفقهية المختارة

۱۹۔ الخليفة الراشد عمر بن عبد العزيز

۲۰۔ الوجيز في أصول الفقه

۲۱۔ التفسير الوسيط

۲۔ڈاکٹر وھبہ زحیلی کی کتابوں کے مضامین

۱۔ فقہ، اصول فقہ، تفسیر، علوم القرآن، قصص القرآن، حدیث، اسلامی تہذیب و ثقافت عقیدہ و ایمان دعوت و تبلیغ پر آپ نے بہت ساری کتابیں لکھیں۔

۲۔ آپ کی تالیفات حجم کے اعتبار سے ۱۶ جلدوں تک ہیں۔ جن کے صفحات تقریباً ۱۰ ہزار بنتے ہیں اور چھوٹا رسالہ ۳۴ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔

۳۔ڈاکٹر اللحام لکھتے ہیں:

في معظم مؤلفاته وأبحاثه الفقهية يلتزم المقارنة بين المذاهب الإسلامية، وفي بعضها يقارن بين المذاهب الفقهية والقوانين الوضعية، و يجلي أفضلية ما ذهب إليه فقهاء الإسلام من أحكام-

آپ نے اکثر مؤلفات اور فقہی مسائل کی تحقیق میں اسلامی مذاہب کے درمیان تقابل کیا ہے اور بعض میں فقہی مذاہب اور ملکی قوانین میں تقابل کرکے فقہائے اسلام کے بیان کردہ احکام کی افضلیت کو واضح کیا ہے۔(۶)

وہ رقم طراز ہیں:

امتازت كتاباته بالنزوع إلى التيسير والتسهيل مع المحافظة على دسم المادة العلمية، وعندما يعقد المقارنات كثيراً ما ينتهي إلى الترجيح المدعم بالدليل-

آپ کی تحریریں علمی روح کے ساتھ آسان اور عام فہم ہوتی ہیں اور تقابل کرتے ہوئے اکثر آپ مؤید دلائل کے ساتھ کسی ایک مسئلے کو ترجیح دیتے ہیں۔(۷)

آپ کی تالیفات کی درج ذیل چار قسمیں ہیں: (۸)

۱۔المؤلفات العلمية المتخصصة (خالص علمی مؤلفات)۔

۲۔التحقيقات والتخريجات (تحقیقات و تخریجات)۔

۳۔الأبحاث الموسوعية (انسائیکلو پیڈیا کے لئے تحقیقی مقالات)۔

۴۔ الأبحاث المقدمة إلى المؤتمرات والندوات (علمی کانفرنس اور سیمینارز میں پیش کئے گئے تحقیقی مقالات)۔

جبکہ علمی رسائل میں لکھے گئے مضامین اسکے علاوہ ہیں۔

اسلامی قانون اور فلسفہ کی وجہ سے مسلم دنیا میں آپ کی رائے کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ آپ نے اسلامی اور عصری قانون سے متعلق کئی کتب تصنیف کیں جو قانون کے طالب علموں کے لئے بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ا۔ آثار العرب فی الفقہ الاسلامی دراستہ مقارنۃ

یہ کتاب دراصل ڈاکٹر صاحب کا Ph-D کے لئے پیش کیا گیا تحقیقی مقالہ ہے۔ جسے انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی کے لاء کالج کے ذریعے پیش کیا اور ۱۹ فروری ۱۹۶۳ء بمطابق ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۸۲ ہجری آپ نے اس کتاب کو افادہ عام کے لئے دنیا کی دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے کی باقاعدہ اجازت دی تاکہ اسلامی شریعت کے حوالے سے جہاد کے بارے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کا ازالہ ہو سکے۔ آپ نے اس کتاب میں جہاد کے تمام احکامات کا ممکنہ احاطہ کیا ہے۔

فاضلِ جلیل شیخ محمد ابوزہرہ فرماتے ہیں:

الحق يقال: لم يدع الأستاذ صغيرة ولا كبيرة في الحرب و آثارها إلا أتى بها-

حقیقت یہ ہے کہ میرے استاد محترم ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے جنگ او راسکے آثار کے حوالے سے کوئی معمولی سی بات کو بھی بیان کئے بغیر نہیں چھوڑا۔(۹)

یہ کتاب ڈاکٹر وھبہ زحیلی کی پہلی شاہکار تصنیف ہے جس کے شائع ہونے کے بعد خطہ عرب اور دیگر اسلامی ممالک سے آپ کو تہنیت اور تشکر کے بے شمار خطوط موصول ہوئے۔ علماء اور محققین نے اس کی تقاریظ لکھیں۔ یہ اپنی نوعیت کی اولین کتاب ہے جو اسلامی جنگ و امن اور اسلام کے عام انٹرنیشنل قانون کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔

منہج و اسلوب

اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے جہاد کے تمام پہلوؤں کو بڑی تفصیل سے واضح کیا ہے۔اس کتاب کا منہج و اسلوب علمی و تاریخی اور تقابلی ہے۔

کتاب و سنت کے صحیح دلائل سے آپ نے احکامات کا استنباط کیا ہے اور ساتھ ساتھ فقہاء کرام کے اقوال کا حوالہ دیا ہے۔نص کی عدم موجودگی میں مصلحت عامہ اور استحسان سے مسئلے کا استنباط کیا ہے۔

آپ نے تمام مذاہب اسلامیہ کا تقابل پیش کیا ہے۔ معروف مذاہب اربعہ کے علاوہ شعبوں کے دو مذاہب امامیہ اور زیدی اور ساتھ اباضی مذہب کو بھی بیان کیا ہے۔ ان تمام کے درمیان تقابل کے بعد جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں اسکا اظہار کیا ہے۔ (۱۰)

یہ کتاب پہلی دفعہ المکتبہ الحدیثیہ دمشق سے ۱۳۸۲ء / ۱۹۶۳ء میں طبع ہوئی۔ اس کے ٹوٹل صفحات کی تعداد ۳۹۰ تھی۔ بعد میں اس کی چوتھی طباعت ۱۹۹۲ء میں دار الفکر دمشق سے ہوئی۔ اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔ فرانس کی سودبون یونیورسٹی سے بعض سکالرز نے اس کی تلخیص کرکے Ph-D کی ڈگری حاصل کی۔

اس کتاب میں ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے اسلامی جہاد کا صحیح تصور پیش کیا ہے۔ کوئی بھی محقق اس کتاب کے مطالعے سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

۲۔التفسیر المنیر فی العقیدہ والشریعۃ والمنہج

تفسیر میں آپ کا کام کافی وسیع ، جامع اور منفرد انداز کا ہے ۔اس طور سے کہ آپ نے تین مختلف تفسیریں مختلف نہج اور الگ الگ اسلوب میں لکھی ہیں ۔ آپ کی کوشش یہ تھی کہ مخاطبین کے فرق مراتب اور ذہنی و فکری تفاوت کے پیش نظر الگ الگ کام کیا جائے اور لوگوں کو ان کے معیار اور سطح کے مطابق قرآن سے جوڑا اور وابستہ کیا جائے تاکہ ہر شخص براہ راست قرآن سے وابستہ ہو اور اس کو سمجھے اور بقدر ظرف اپنا حصہ تلاش کرے۔ اصل تفسیر تو وہی ہے جو ہر شخص قرآن سے براہ راست تعلق قائم کرنے کے نتیجے میں خود اپنے دل میں محسوس کرے۔ آپ کی سب سے ضخیم اور بلند پایہ تفسیر التفسیر المنیر ہے جو سولہ جلدوں پر مشتمل ہے ۔ اس تفسیر میں آپ نے تفسیر سے متعلق تمام قدیم و جدیداہم بحثوں کو تفصیل اور گہرائی کے ساتھ اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ آپ کی سب سے بلند معیار اور تفصیلی تفسیر ہے ۔ اس تفسیر کے مقدمے میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

> فی الأصیل من ذا المؤلّفه و ربط المسلم بکتاب الله عزّ وجلّ ربطا علمیا وثیقا۔
>
> در اصل اس تالیف سے میرا مقصد لوگوں کو قرآن سے قریب کر دینا قرآن کے ساتھ ایک مضبوط علمی ربط قائم کر دینا ہے۔(۱۱)

اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کریم کے بارے میں یہ امر مسلمہ ہے کہ روئے زمین پر آج تک کسی کتاب کی اس قدر تفسیر تشریح نہیں ہوئی جس قدر قرآن حکیم کی ہوئی ہے۔ تاہم لوگ ہمیشہ کسی ایسی تعبیر کی تلاش میں رہتے ہیں جو بہترین اور عام فہم ہو جو آسانی سے ان کی سمجھ میں آئے۔

ڈاکٹرسید اللحام نے اس تفسیر کے عام فہم اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وهذا التفسير(التفسير المنير)، قدم فيه الأستاذ الدكتور محاولة جادة ليكون عصري الإسلوب والعرض، قديم الأصول والمادة، يجمع بين أصالة القديم و عراقته، وروعة الجديد و جاذبيته، تلبية لحاجة أهل هذا العصر-

اگر غور کیا جائے تو ڈاکٹر وھبہ زحیلی کی تفسیر المنیر ایک ایسی علمی کاوش ہے جو عام فہم ہے۔ اس میں ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے جدید عصری اسلوب کو اپنایا ہے۔ قدیم اصول تفسیر اور قواعد کو جمع کر کے جدید و قدیم کا ایک حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ یہ ایک شاندار عمدہ اور پرکشش تفسیر ہے۔یہ لوگوں کی عصری ضرورت کو پورا کرتی ہے۔(۱۲)

ڈاکٹر وھبہ زحیلی اس تفسیر کے حوالے سے خود بیان کرتے ہیں۔

ولست في كل ما أكتب متأثراً بأي نزعة معينة، أو مذهب محدد، أو إرث اعتقادي سابق لا تجاه قديم، وإنما رائدي هو الحق الذي يهدي إليه القرآن الكريم على وفق طبيعة اللغة العربية، والمصطلحات الشرعية، مع توضيح آراء العلماء المفسرين بأمانة ودقة و بعد عن التعصب-

میں نے اس تفسیر کو کسی خاص جہت سے متاثر ہوکر نہیں لکھی اور نہ کسی ایک مذہب تک محدود کی ہے۔ میرا طریقہ اس حق بات کی وضاحت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے عربی زبان اور شرعی اصطلاحات کے مطابق راہنمائی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تفسیری وضاحت میں مفسرین کرام کی آراء کو پوری دیانتداری کے ساتھ بغیر کسی تعصب کے بیان کیا ہے۔(۱۳)

ا۔ منہج و اسلوب:

ہر سورت کی ابتداء میں اجمالاً اس کی فضیلت اور اس سے اخذ شدہ احکام کو بیان کیا ہے۔

۲۔ آیت قرآنی کو مناسب عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔
۳۔الگ اور ایک جیسے موضوع پر مشتمل آیات کے درمیان مناسبت کو بیان کیا ہے۔
۴۔اسباب نزول کا بھی اہتمام کیا ہے۔
۵۔قصص الانبیاء کو اسرائیلی روایات سے مبرا بیان کیا ہے۔

۲۔طباعت و ترجمہ:

اولاً یہ تفسیر سن ۱۹۹۱ء میں دار الفکر دمشق سے ۱۶ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۱۰ ہزار سے زائد ہے۔ اب تک یہ کئی بار شائع ہوچکی ہے۔ اس کی تفسیر کے اہمیت کے پیش نظر ترکی اور فارسی زبان میں اس کے تراجم ہوچکے ہیں۔

آپ کی دوسری تفسیر التفسیر الوجیز ہے جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ متوسط درجے کے لوگوں کے لئے مرتب کی گئی ہے، بلکہ یہ آپ کے وہ دروس ہیں جو تسلسل کے ساتھ آپ سے ٹی وی چینل پر نشر کرائے گئے تھے اور بعد میں نظر ثانی اور اہتمام کے ساتھ کتابی شکل میں منظر عام پر لائے گئے۔ مبتدی طلبہ اور قارئین کے لئے آپ نے ایک الگ تفسیر التفسیر الوسیط کے نام سے تیار فرمائی جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

۳۔الفقہ الاسلامی فی أسلوب الجدید

۱۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے جس میں الفقہ الاسلامی و ادلتہ کے بعض درج ذیل ابواب و عنوانات شامل ہیں: (۱۴)

العقوبات الشرعية، و عقود التبرعات، الهبة، والوديعة والعارية، والإطلاقات والتوثيقات، الوكالة والكفالة، والحوالة والصلح، والإكراه والجهاد، والمعاهدات وأحكام المرتدين، وأحكام الأراضي، والسبق والمفقود، واللقطة واللقيط، والقضاء و طرق الإثبات وأدب القاضي، والدعاوي-

۲۔ دراصل وھبہ الزحیلی نے اس کتاب کو فقہ پڑھنے والوں کی سہولت کے لئے تالیف کیا ہے۔ فقہیہ سے شغف رکھنے والے لوگ جنہیں فقہاء کرام کی قدیم کتب میں سے دقیق مسائل سمجھ نہیں آتے وہ آسانی سے اس کتاب کی مدد سے سمجھ سکتے ہیں۔(۱۵)

۳۔ اس کتاب کا منہج بھی منفرد ہے۔ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے اس کتاب میں فقہہ حنفی پر اعتماد کر کے اس سے بنیادی مسائل کو بیان کیا ہے اور دیگر مذاہب کے اختلافات کو دلائل سے واضح کیا ہے۔

۴۔مسائل کے بیان میں طوالت سے گریز کیا ہے۔

۵۔ڈاکٹر السید اللحام نے اس کتاب کی وجہ تسمیہ کو اس طرح بیان کیا ہے۔

الفقه الإسلامي في أسلوبه الجديد فلكونه نهج في كتابته لا على مثال سبق فيما نجده بين أيدنا من كتب الفقه، لأنه يضع أما القرى نموذجا من اختلاف الأئمة في أهم أحكم المسائل-

الفقہہ الاسلامی فی اَسلوب الجدید کا یہ نام اس لئے ہے کہ بقول مصنف اس کا منہج و اسلوب اس طرح منفرد ہے کہ اپنی تحریر کے اعتبار سے ہمارے سامنے موجود کتب فقہہ میں سے کسی سابقہ کتاب میں اس کی مثال نہیں۔ یہ کتاب پڑھنے والے کے سامنے فقہاء کرام کے اہم احکام مسائل میں ائمہ کے اختلافات کو بطور نمونہ رکھتی ہے۔(۱۶)

اس کتاب کے منہج و اسلوب کو عوام میں بہت پذیرائی ملی اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مصنفؒ نے اس کتاب کی تالیف میں چار سال لگائے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء میں دمشق سے چھپی۔

۴۔ نظریۃ الضرورۃ الشرعیہ (دراسۃ مقارنۃ مع القانون الوضعی)

فقہہ اسلامی کا ایک اہم قاعدہ ہے یہ (الضرورات تبیح المحظورات) بعض لوگوں کو اس قاعدے نے مغالطے میں ڈالا اور انہوں نے اس کا اطلاق فرائض پر بھی کرنا شروع کیا۔ حالانکہ اس قاعدہ کا مقصد صرف ضرورت شرعیہ کا ادراک تھا، بہت سے مقامات پر محض خواہش نفسانی کی بناء پر سہل پسندی اور تن آسانی کے لئے ممنوع اور حرام کو استعمال کرنے کے لئے اس کا اطلاق کیا گیا۔ اہمیت موضوع کے باوجود ڈاکٹر وھبہ زحیلی سے پہلے اس پر اس قدر تفصیل سے نہیں لکھا گیا۔

منہج و اسلوب:

ا۔ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے اس تالیف میں ضرورت شرعی کا حالات و واقعات کے مطابق اطلاق و انطباق کے قواعد و ضوابط بیان کئے ہیں۔

۲۔ مذاہب اربعہ کے فقہاء کی آراء کو بیان کیا ہے دلیل کے ساتھ ہر مذھب کے مسئلہ کو بیان کیا ہے۔پھر ان میں تقابل کیا ہے اور ان میں موجود مسئلہ قوی اور قابل ترجیح دلائل کی بناء پر بیان کیا ہے۔

۳۔ اس کتاب میں کثیر تعداد میں احادیث سے استدلال کیا گیا ہے۔ جس کی مصنفؒ نے حاشیہ میں مجمل تخریج کی ہے۔

۴۔ اس کتاب کے مصادر علمی متنوع قسم کے ہیں۔ ان میں زیادہ تر کتابیں قواعد شرعیہ، اصول فقہہ اور سول و فوجداری مقدمات کے لئے ملکی وضعی قوانین سے متعلق ہیں معروف مطابع، دار الفارابی، مصر، مؤسۃ الرسالہ بیروت لبنان اور دار الفکر دمشق شام سے اس کی طباعت ہوتی رہی ہے۔

۵۔ نظریۃ الضمان (أو أحکام المسؤولیہ المدینۃ والجنائیۃ في الفقہ الاسلامی) دراسۃ مقارنۃ)

اس کتاب کا موضوع: جان و مال کے تحفظ کا نظریہ ہے۔جو عمداً یا خطاً سرکشی کی بناء پر لازم ہے۔

منہج و اسلوب:

۱۔ مذاہب اربعہ کا نظریہ ضمان بیان کر کے اہم مسائل میں ان کے اتفاق اور اختلاف کو بیان کیا گیا ہے۔مذہب حنفی کو مذکورہ أحکام میں ترجیح دی ہے۔

۲۔ ایک طرف فقہی اختلاف کو بیان کیا ہے تو دوسری جانب مصری وضعی قوانین کو بیان کر کے ان دونوں کے درمیان تقابل کیا ہے، جدید قانونی فکر کے مقابلے میں فقہاء اسلام کے بلندی فکر کو خوب واضح کیا ہے۔

عظیم معاصر محقق مصطفی الزرقاء نے اس کتاب کے بارے میں کہا:

وهو كتاب جيد جداالغرض التدريس الجامعي-

یہ کتاب یونیورسٹی لیول پر پڑھانے کے لئے نہایت عمدہ ہے۔(۱۷)

۶۔ أصول الفقہ الاسلامی

ائمہ اسلام نے دو علوم: علم أصول الفقہہ اور علم مطلع الحدیث ایسے ایجاد کئے ہیں جن کی مثال کوئی اور مذہب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اصول فقہ کو علماء نے علوم شرعیۃ میں سب سے اہم مقام دیا ہے۔ شرعی احکام کے استنباط کے لئے اصول فقہہ کے قواعد سے شناسائی ایک ضروری امر ہے۔ ڈاکٹر وہبہ زحیلی کا کام اس میدان میں بھی نمایاں کام کیا ہے۔ اس موضوع پر ان کی بہترین کتاب:اصول الفقہ الاسلامی ہے۔ یہ

کتاب کافی دقیق اور علمی ہے۔ قدیم و جدید کو جمع کرنے کی ایک قابل قدر کوشش ہے۔ یہ کتاب انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کتاب 'اصول الفقہ الاسلامی' کو بھی کئی عرب یونیورسٹیز میں نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے ۔ جامعہ اسلامیۃ مدینہ اور جامعہ الامام ریاض میں یہ کتاب باقاعدہ دراسات علیا کے نصاب کا حصہ ہے۔ ہندوستان کے کئی اداروں میں بھی اسے داخل نصاب یا مرجع کی حیثیت سے قبول کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے نمایاں امتیازات درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ کتاب امتیازی شان کی حامل ہے۔ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے اس میں قدیم اور جدید اصول جمع کئے ہیں۔

۲۔ اس کتاب میں اصول فقہ اسلامی اور جدید وضعی قوانین کے اصول کے درمیان موازنہ کیا گیا ہے۔

۳۔احادیث کی تخریج اجمالاً کردی گئی ہے۔

۷۔الفقہ الاسلامی و ادلتہ

پروفیسر ڈاکٹر شیخ وھبہ الزحیلی کی زندگی کا سب سے اہم علمی و تحقیقی کام الفقہ الاسلامی و ادلتہ ہے۔ یہ کتاب گیارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ آخری جلد مختلف فہارس پر مشتمل ہے۔ یہ در اصل فقہ مقارن پر ایک بے مثل اور منفرد کام ہے ۔ انفرادی طور پر فقہ مقارن کے میدان میں کی جانے والی قدیم و جدید تاریخ میں یہ سب سے بڑی پیشکش، عظیم کارنامہ اور جامع ذخیرہ ہے ، اور اپنے مشمولات کے اعتبار سے یہ الموسوعۃ الفقھیۃ کویت کے بعد جو ایک پوری اکیڈمی کی محنتوں کا ثمر ہے ،فقہ مقارن کا دوسرا سب سے بڑا علمی ذخیرہ مانا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں موضوعات اور مضامین کی جامعیت کے ساتھ ساتھ مسالک اور ائمہ کا بھی عمدہ انداز سے احاطہ کیا گیا ہے ۔ مسالک اربعہ کے علاوہ چار دوسرے بڑے مسالک جعفریہ ، زیدیہ ، اباضیہ اور ظاہریہ اور بڑے ائمہ کی آراء کو سامنے رکھتے ہوئے تقابلی مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ ساتھ ہی قدیم غیر ضروری موضوعات سے پہلو تہی بھی کی گئی ہے۔

الفقہ الاسلامی و ادلتہ کی اہمیت و افادیت کو دیکھتے ہوئے کئی اسلامی یونیورسٹیز نے اسے داخل نصاب کیا ہے اور اسے مراجع کی حیثیت دی ہے۔ اسلامی یونیورسٹی پاکستان اور سوڈان میں یہ باقاعدہ نصاب کا حصہ ہے۔فقہ مقارن میں مرجع کی حیثیت سے ہر اسلامی یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت ہے۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی کی یہ شاہکار تصنیف پہلی مرتبہ دار الفکر دمشق سے ۱۴۰۴ ھ / ۱۹۸۴ء کو طبع ہوئی۔ڈاکٹر سید اللحام اس بارے میں رقمطراز ہیں:

يمثل هذا الكتاب ذروة عطاء المؤلف في مجال الفقه الإسلامي، حيث أفرغ فيه غاية جهده، وخلاصة عمره في الكتابة والتأليف والدراسة والتدريس، حتى أصبح هذا الكتاب درة في بابه، وأقبل عله جمهور المسلمين وخاصتهم ينهلون من معينه، و يستفيدون من تجربته-

فقہ اسلامی کے باب میں یہ مؤلف کے علم کا نچوڑ ہے۔ اس کتاب پر انہوں نے محنت کی حد کر دی ہے۔ یہ کتاب ان کی زندگی بھر کے تالیف و تصنیف اور درس و تدریس کا خلاصہ ہے۔ حتی کہ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے انمول موتی ہے۔ تمام مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ اہل علم اس کے علمی چشمے سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور اس کے تجربہ سے مستفید ہوتے ہیں۔(۱۸)

اس کے بارے میں مؤلف ؒ نے الفقہ الاسلامی و ادلتہ کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے۔

وبما أنني ما زلت مؤمناً بأن المستقبل للإسلام وفهه وتشريعاته، وإن عطل بعض الناس الانتفاع بنظامه، بالقوانين الوضعية المستوردة، فإني حريص على بيان أحكامه ذا الفقه؛ لأن ذلک التعطيل ردة موقوتة ليس لها دعائم بقاء أو استقرار أو احترام فی أذهان المسلمين، بدليل ظهور صحوة مباركة فی بدايته ذا القرن الخامس عشر الهجری، وبروز اتجاه قوی نحو العودة بالفعل لتطبيق الشريعة الإسلامية فی شتی المجالات، وقد بدأت فعلاً لجان علمية متخصصة تنفذ قرارات وزراء العدل العرب بوضع قانون موحد مستمد من الشريعة الإسلامية فی النطاقين المدنی والجنائی -

مجھے ہمیشہ سے اس بات پر پختہ یقین ہے کہ دنیا کا مستقبل اسلام، اس کے فقہ اور شرعی مسائل سے وابستہ ہے اگرچہ بعض لوگوں نے درآمد شدہ وضعی قوانین کے بدلے میں اسلام کے نظام سے فائدہ اٹھانے کو چھوڑ دیا ہے۔ میں ذاتی طور پر احکام فقیہ بیان کرنے کا بڑا حریص ہوں کیونکہ یہ تعطل وقتی رد عمل کا اثر ہے۔ ورنہ اس کا کوئی دائمی وجود

استقرار اور احترام مسلمانوں کے ذہنوں میں نہیں ہے۔ اس دلیل کی بناء پر کہ پندرھویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کے اندر بیداری کی ایک لہر دوڑی ہے اور شریعت اسلامیہ کی تطبیق کی طرف لوٹنے کا کئی میدانوں میں حقیقی معنوں میں طاقت کی جہت کا ظہور ہوا ہے۔ مخصوص علمی کمیٹیوں نے حقیقی معنی میں عرب وزراء قانون کی قراردارو کو عملا نافذ کرنا شروع کر دیا ہے۔ ایسے قوانین کی تشکیل کی صورت میں جو سول اور فوجداری دونوں دائرہ کاروں کے اعتبار سے شریعت سے مستنبط ہوتے ہیں۔(۱۹)

الفقہ الاسلامی و ادلتہ کا منہج و اسلوب

ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے پوری کتاب کو چھ بڑی اقسام میں تقسیم کیا ہے اور ہر قسم کے تحت ابواب بندی کی ہے اور پھر ابواب کے ذیل میں فصول بیان کی ہیں اور پھر فصول کی مزید تقسیم مباحث میں کی ہے جس سے متعلقہ موضوع بحث کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے اس کتاب کی تقدیم میں اس کتاب کے غرض و غایت اور منہج و اسلوب کو خود دہی بڑے علمی پیرائے میں واضح کیا ہے۔ وہ زندگی کے معاملات اور معاشرتی تعلقات کو الوہی عقیدہ اور مضبوط اخلاق و کردار سے وابستہ کرتے ہیں۔(۲۰)

ڈاکٹر زحیلی لکھتے ہیں:

وقد كان الفقه الإسلامى الذى مايزال موضع اعتزاز وفخار وتقدير بين أنواع الفقه العالمى خير صورة عملية للمسلمين-

فقہ اسلامی کو ہمیشہ سے مسلمانوں کی بہترین عملی صورت اورعالمی سطح پر دیگر مذاہب کے درمیان باعث عزت و افتخار اور قدر منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔(۲۱)

وہ لکھتے ہیں:

وكان الفقه الأكبر: وهو معرفة النفس مالها وماعليها، والفقه بالمعنى الضيق وهو الأحكام الشرعية العملية:

فقہ اسلامی کا بلند مقصد تو نفس کے حقوق فرائض کو جاننا ہے جبکہ اپنے محدود معنوں میں عملی طور پر احکام شریعہ کاادراک ہے۔(۲۲)

الفقہ الاسلامی ادلتہ کی غرض و غایت کے حوالے میں وہ لکھتے ہیں کہ فی زمانہ اس چیز کی بڑی اشد ضرورت ہے کہ ایک ایسی نئی کتاب لکھی جائے جس سے فقہی مسائل کے فہم میں آسانی ہو، اسلوب جدید ہو، اور محض قانون سازی کے لئے اس کی طرف رجوع کرے۔ وہ کتاب کسی ایک مذہبی مکتب فکر کی نمائندہ نہ ہو کیونکہ

لأن فقه مذهب لا يمثل فقه الشريعة كله-

کوئی ایک فقہی مذہب تمام شرعی فقہہ کی نمائندگی نہیں کرتا۔(۲۳)

وہ مزید لکھتے ہیں:

وكون أحد آراء الفقهاء من دون تعيينه و الحق والصواب - باعتبار أن الحق واحد لا يتعدد - لايمنع الأخذ بأى رأى فقهى؛ لتعذر معرفة الأصوب بسبب انقطاع الوحى والنبوة، إلا أن يتضح لنا رجحان الرأى بدليله الأقوى.

یہ کہ فقہاء کی آراء میں سے کوئی ایک بغیر کسی تعیین کے حق اور درست ہے اس اعتبار سے کہ حق ایک ہوتا ہے ہر بات نہیں۔ یہ کسی ایک فقہی رائے پر عمل کرنے میں مانع نہیں کیونکہ وحی اور نبوت کے ختم ہونے کیوجہ سے کسی ایک رائے کو صحیح قرار دینا ممکن نہیں سوائے اس کے کہ اس رائے کا کسی قوی دلیل سے راجح ہوناثابت ہو جائے۔(۲۴)

الفقہ الاسلامی کے مقدمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زحیلی کھلے دل و دماغ سے کسی مسئلہ کے بارے میں سوچنے کے قائل تھے اسی لئے انہوں نے اپنی کتاب میں اسلام کے تمام فقہی مذاہب کو جگہ دی۔اس کتاب کے منہج و اسلوب سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے۔

ا۔جدید اسلوب و ترتیب:

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے اس کتاب میں عصری تقاضوں کے مطابق شاندار نظم و ترتیب کو اپنایا ہے۔ عصر حاضر میں کتب کے جدید انداز میں نظم و ترتیب کے جملہ تقاضے اس میں پورے کئے گئے ہیں۔

۲۔مصادر شرعیہ سے استنباط احکام کا اہتمام

شرعی احکام کے استنباط میں ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے اپنی کتاب میں بنیادی مصادر شرعی کو مد نظر رکھا ہے۔ سب سے پہلے قرآن کریم، اس کے بعد سنت مطہرہ اور اس کے بعد شرعی روح کے مطابق اجتہاد بالرائے سے احکام کے استنباط کیا ہے۔انہوں نے لکھا ہے:

إنه كتاب فقه الشريعة الإسلامية المعتمد على الدليل الصحيح من القرآن والسنة والمعقول، لا فقه السنة وحدها، ولا فقه الرأى وحده، إذ ليس عمل المجتهد معتبراً بغير الاعتماد على القرآن والسنة-

یہ کتاب شریعت اسلامی کے فقہ کو قرآن و سنت اور عقلی دلائل صحیحہ کے ذریعہ سمجھنے پر مشتمل ہے۔ نہ تو محض سنت سے فقہہ کی تفہیم ہے اور صرف ذاتی رائے پر مشتمل فقہہ ہے۔کیونکہ مجتہد کا کوئی عمل قرآن و سنت کے دلائل کے بغیر معتبر نہیں۔(۲۵)

(یہاں انہوں نے" عمل المجتہد" کہہ دیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں ان کا اجتہادات بھی شامل ہیں۔

۳۔معروف سنی مذاہب اربعہ کا تقابل:

اہل سنت وجماعت کے چار متداول مذاہب فقہ، حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مذہب کے درمیان تقابل پر اکتفاء کیا ہے۔ لیکن بعض مقامات پر موضوعات کے تقاضے کے پیش نظر دیر اسلامی مذاہب جیسے شعبہ امامیہ اور اباضیہ کو بھی بیان کیا ہے۔

اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

وبكلمة موجزة: يمتاز هذا الكتاب الشامل فقه المذاهب باعتماده – وهو اعتماد المذاهب الإسلامية نفسها – على استنباط أحكامه من مختلف مصادر التشريع الإسلامى النقلية والعقلية (الكتاب والسنة والاجتهاد بالرأى المعتمد على روح التشريع الأصلية العامة) فمن قصر الفقه الإسلامى على القرآن وحده فقد بتر أو مسخ الإسلام من جذوره، وكان أقرب لأعداء الدين، ومن حصر الفقه بالسنة وحدها فقد قصَّر وأساء ، وعاش قاصر الطرف عن شؤون الحياة، وبعد عن التفاعل أو التجاوب مع متطلبات الناس، وتحقيق مصالحهم-

مختصر یہ کہ یہ کتاب معتمد فقہی مذاہب پر مشتمل ہے۔ فقط ان اسلامی فقہی مذاہب پر جنہوں نے احکام کااستنباط اسلامی شریعت کے مختلف مصادر علمی جیسے کتاب و سنت اور شرعی روح کے مطابق اجتہاد بالرائے سے کیا ہے۔ لہذا جس نے فقہہ کو صرف قرآن سے استنباط کرنے کی کوشش کی تو اس نے اس کو کاٹ دیا یا اسلام کو اس طرح جڑوں سے کاٹ دیا جو کہ دین دشمنوں کے زیادہ قریب ہے۔ اور جس نے فقہہ کو فقط سنت تک محدود کیا تو اس نے کاٹ دیا اور غلط کیا اور زندگی کے امور سے چشم پوشی کرنے والا بنا اور وہ لوگوں کے مطالبات و ضروریات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے سے دور ہوا۔(۲۶)

۴۔فقہی مذاہب کے معتبر اور قابل اعتماد کتب سے استفادہ

الفقہ الاسلامی کے مصادر علمی میں مذاہب اربعہ اور دیگر مذاہب اسلامیہ کے نہایت معتبر اور ثقہ کتب شامل ہیں۔ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے ائمہ مذاہب کے ان اقوام و آراء کو بیان کیا ہے جو ان کی امہات الکتب میں درج ہیں او رجن کتب پر فتوی کا دارو مدار ہے اور ہر مذہب کے مقلدین ان پر عمل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر زحیلی نے تمام فقہی مذہب کے معتبر کتب سے ان کی آراء اور استنباط شدہ مسائل کو بیان کرنے کی وجہ وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

لأن نقل حكم فی مذهب من كتب المذاهب الأخرى لايخلو من الوقوع فی غلط فی بيان الرأی الراجح المقرر-

کیونکہ کسی ایک مذہب فقہی کا حکم دوسرے مذاہب کی کتب سے نقل کرنے میں غلطی کا امکان موجود ہوتا ہے جو ان کی طے شدہ رائے ہوتی ہے۔(۲۷)

ڈاکٹر وھبہ زحیلی جب بھی کسی مسئلہ کو زیر بحث لاتے ہیں تو اکثر انہوں نے اس کے مصدر اصلی کی حاشیہ میں تخریج کی ہے کہ یہ مسئلہ اصل میں فقہی مذہب کے کس کتاب میں کہاں بیان ہوا ہے۔

۵۔فقہاء اسلام کے متفقہ آراء بیان کرنے کا اہتمام

الفقہ اسلامی و ادلتہ میں ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے فقہاء کرام کے درمیان اختلاف کو نظر انداز کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ان کے درمیان متفقہ آراء کو ہی بیان کیا جائے۔

یعنی اس کتاب میں انہوں نے مثبت پہلو کو سامنے رکھا ہے اور غیر ضروری اور ایسی تعبیر و تفسیر جو پختہ نہ ہوں ان کے بیان سے اجتناب کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ زیادہ فائدہ مند چیز ہے اور عالمی سطح پر جو تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے اس کی ایک جہت ہے۔جس سے مذہبی تعصبات میں کمی واقع ہوتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

ومع ذلک فإنی أحاول دائماً التنویه بالرأی الموحد بین فقهاء المذاهب، لا فی مجرد العناوین لأحکام فقهیة، بل فی الشروط والتفصیلات أیضاً-

میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ فقہاء کرام کے درمیان جو ایک رائے اتفاق ہوا سے بیان کروں نہ صرف یہ کہ بحث کا عنوان ایک جیسا ہو بلکہ کسی حکم کی شروط اور تفصیلات میں بھی اتفاق ہو۔(۲۸)

۶۔مذاہب فقہاء کے درمیان تقابل

یہ ایک مشکل امر ہوتا ہے کہ تمام مذاہب کی آراء کو بیان کرکے ان کے درمیان تقابل کیا جائے اور جزئیات کو بھی اس طرح بیان کیا جائے کہ کوئی محقق اپنی مطلوبہ چیز کو اخذ کرے۔ وھبہ زحیلی نے اس کا خوب اہتمام کیا ہے۔

۷۔صحت حدیث کا اہتمام:

ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے مسائل کو صحیح احادیث سے بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ جن احادیث سے فقہاء کرام نے مسائل کا استدلال کیا ہے ان کی تخریج کا اہتمام کیا ہے او ران کی صحت کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ جن احادیث پر انہوں نے سکوت اختیار کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مقبول حدیث ہے۔وہ لکھتے ہیں:

وإذا لم أذکر ضعف الحدیث فلأنه مقبول صحیح، عملاً بالأصل العام فی الحدیث-

اور اگر میں کسی حدیث کا ضعف بیان نہ کروں تو یہ اس لئے کہ وہ مقبول اور صحیح ہے۔(۲۹)

۸۔احکام فقہیہ کا استیعاب:

ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے مختلف فقہی مسائل سے احکام کا استیعاب کیا ہے او رمتام مذاہب فقہیہ کے ما بین مسائل کا تقابل کیا ہے یہ اس لئے کہ جب مختلف آراء کے درمیان تقابل کیا جائے تو محقق اپنا مطلوبہ مسئلہ ڈھونڈ نکالے اور اپنی تشنگی کو دور کرے۔

۹۔متروکہ احکام و مسائل سے اجتناب

فقہ اسلامی کی کتب میں اسلاف نے وقت کے تقاضوں کے پیش نظر وہ مسائل بیان کئے تھے جو ان زمانے کی ضرورت تھی وقت کے ساتھ ساتھ وہ مسائل متروک ہوگئے یا ان کی ضرورت نہ رہی ان کا بیان محض تاریخی حیثیت بیان کرنے کے لئے تو ٹھیک ہے لیکن عصری ضرورتوں کے لئے وہ فرضی ہیں ان میں سے ایک مسئلہ غلاموں سے متعلق احکام ہیں۔ الفقہ الاسلامی میں رق اور عبد سے متعلق مسائل کو نظر انداز کیا گیا ہے اور محض عملی اور ضروری مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے خود لکھا ہے:

لعدم الحاجۃ إليه بعد إنهاء هذه المشكلة وإلغاء الرق من العالم-

اس لئے کہ یہ رق اور عبد سے معلق مسائل ختم ہو چکے ہیں کہ دنیا سے غلاموں کا وجود ختم ہوگیا ہے۔(۳۰)

۱۰۔ترجیحی مسئلہ کی وضاحت:

ائمہ مذاہب اور اصحاب فتوی سے منقول آراء کو بیان کرکے قوت دلیل کی بناء پر جو رائے قوی لگی اس کو بیان کیا ہے۔ کسی ایک رائے کو ترجیح نہ ملنے کی صورت میں اس رائے پر عمل کرنے کو ترجیح دی ہے جس پر ائمہ کی اکثریت یا جمہور نے عمل کیا ہو۔ انہوں نے اس بات کو اصول تلفیق اور حاجت اور ضرورت کے وقت دو راستوں میں سے آسان کو اختیار کرنے کی رخصت کے اصول کے تحت جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح مختلف آراء کو بیان کرکے ان میں کسی بھی فقہی مذہب کی رائے جو کسی مصلحت کو پورا کرنے والی ہو یا نقصان دہ امر کو دور کرنے والی ہو اس کو بیان کرتے ہیں۔ یا جس رائے پر اکثریت کا اتفاق ہو لیکن اس میں بھی جو رائے موجود حالات میں زندگی کے شرعی احوال کے ساتھ مطابقت نہ رکھتی ہو اس کو بھی چھوڑ دیتے ہیں۔

۱۱۔جدید مسائل کا بیان:

یہ کتاب عصری تقاضوں کے مطابق ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ جدید فقہی مسائل میں اپنے اجتہادات کو بیان کیا ہے اور ان کے حل میں فقہاء کی آراء کو بنیاد بنایا ہے۔

۱۲۔عام فہم اسلوب:

اس کتاب کی سب سے بڑھ کر امتیازی حیثیت یہ ہے کہ کتاب کا اسلوب نہایت آسان اور عام فہم ہے۔ علمی ابحاث کو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ کتاب کا نظم اور ترتیب عصری تقاضوں کے مطابق ہے۔ ہر مذہب کی تحقیقی رائے کو بیان کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے قاری کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اور آسان اسلوب کی وجہ سے مشکل مسائل کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے اس کتاب کی تالیف کی غرض و غایت میں یہ بھی لکھا ہے:

فقد صممت على الكتابة مستعيناً بالله تعالى، لتقريب الفقه إلى الناس، سواء العالم والمتعلم، من غير تعصب لرأي مذهبي معين؛ لأن الحكمة ضالة المؤمن أينما وجدها التقطها-

میں نے اللہ تعالی کی مدد سے یہ ارادہ کیا کہ فقہہ کو لوگوں کے لئے خواہ عالم ہو یا متعلم آسان بناؤں بغیر کسی خاص مذہبی تعصب کے کیونکہ حکمت مؤمن کی گمشدہ میراث ہے جہاں اسے پائے حاصل کرے۔(۳۱)

مزید وہ بیان کرتے ہیں:

وأصبح من الصعب العثور على فهم إيجابى للمسلم لحياة العصر، بسبب ازدواج الثقافة العلمية المادية والشرعية،أو بسبب العمل بالتقنينات الوضعية المستوردة والنظريات الاقتصادية الحديثة- لكن يظل فى أعماق الساحة الإسلامية قلَّة من الرجال أو الشباب الذين فهموا ما يتطلبه الإسلام، وحياة المسلم المعاصر.

کیونکہ جدید ٹیکنالوجی اور معاشی نظریات سے یہ عمل یا جدید ثقافتی اور شرعی علوم کے باہم مل جانے کی وجہ سے عصر حاضر میں مسلمانوں کے لئے زندگی کے کسی مثبت فہم کو حاصل کرنا ایک مشکل امر

بن گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اب بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اسلام کو سمجھ کر مسلمانوں کی عصری تقاضوں کے مطابق رہنمائی کر رہے ہیں۔(۳۲)

۱۳۔ کتاب کی طباعت اور جلدوں کی تعداد:

ڈاکٹر سید اللحام کے مطابق سب سے پہلے یہ کتاب سن ۱۹۸۴ء میں آٹھ (۸) جلدوں میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ سن ۱۹۹۱ء میں یہ کتاب دوسری مرتبہ نو (۹) جلدوں میں طبع ہوئی۔ سن ۱۹۹۷ء بمطابق ۱۴۱۸ھ کو یہ کتاب چوتھی مرتبہ گیارہ (۱۱) خوبصورت جلدوں میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی اور سن ۲۰۰۱ تک یہ کتاب ۲۳ مرتبہ زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہے۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کس قدر مقبولیت عامہ اختیار کر چکی ہے۔ یہ کتاب یہ یونیورسٹی میں شامل نصاب ہونے کے ساتھ ساتھ معروف کتب خانوں کی زینت ہے۔(۳۳)

خلاصہ بحث

ڈاکٹر وہبہ زحیلی جب تک طالب علم رہے پڑھائی اور مطالعے کے دلچسپ مشغلے سے اپنے آپ کو کبھی فارغ نہیں ہونے دیا اور جب زندگی کے عملی میدان میں آئے تو محیر العقول کارنامے انجام دیے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا ادراک طالب علموں کو غیر معمولی بلندیوں اور کامیابیوں سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عصر حاضر میں اس نابغہ روزگار کے علمی کارناموں سے استفادہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے ہر ابھرتے ہوئے موضوع پر لکھا ہے اور وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق شرعی اصولوں کی روشنی میں مسئلہ کو آسان کرکے بتایا۔ عبادات و معاملات سے متعلق تمام مسائل پر انہوں نے اپنی گران قدر تصانیف میں شرعی دلائل کے ساتھ عصری ضرورت کے مطابق سیر حاصل بحث کی ہے۔ اگر ان کی کتابوں کی عمیق بینی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ہمیں بہت سی ادق مسائل کے حل میں مفید ثابت ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے بلاشبہ منفرد اسلوب کے مؤلف تھے، جو عصری تقاضوں کے مطابق مسائل کو مسلمانوں کے فائدے کے لئے بیان کرتے تھے۔ ان کا اسلوب تحریر شگفتگی، شائستگی، سنجیدگی، برجستگی، سادگی اور سلاست کا شاہکار نمونہ تھا۔ آپ اسلام اور مسلمانوں کے لئے بڑے متفکر رہتے تھے لیکن کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ان کی شاہکار علم کے انمول موتی آج بھی ہر سو علم کا نور پھلائے ہوئے ہے۔

حوالہ جات

(۱) النحل،۱۶: ۴۳

(۲) ابو داود، سلیمان بن اشعث السنن۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۴ء، ج۴، ص۱۰۹، ح۴۲۹۱۔

(۳) وھبہ الزحیلی، الفقہ الحنبلي المیسر، ص۵

(۴) اللحام، ص۴۱، أیضا، الإمام الحافظ جلال الدین السیوطي، ص۱۷۴

(۵) اللحام، وھبہ الزحیلی ص۷۸-۷۹

(۶) اللحام، وھبہ الزحیلی ص۴۲

(۷) أیضا، ص۴۲

(۸) أیضا، ص۴۳

(۹) اللحام، وھبہ الزحیلی ص۸۰

(۱۰) أیضا، ص۸۳-۸۴

(۱۱) الزحیلی، دوہبۃ بن مصطفی، التفسیر المنیر فی العقیدۃ والشریعۃ والمنہج، دمشق، السوریہ، دار الفکر المعاصر، ۱۴۱۸ئ، ج۱، ص۶

(۱۲) اللحام، وھبہ الزحیلی ص۱۰۰

(۱۳) وھبہ الزحیلی، التفسیر المنیر، ج۱، ص۷، اللحام، وھبہ الزحیلی ص۱۰۱

(۱۴) اللحام، وھبہ الزحیلی ص۱۰۶

(۱۵) وھبہ الزحیلی، الفقہ الاسلامی فی أسلوب الجدید، ۲: ۳

(۱۶) اللحام، وھبہ الزحیلی ص۱۰۷

(۱۷) زرقا، الفصل الضار والضمان، ص:۱۳

(۱۸) اللحام، وھبہ الزحیلی ص۸۷

(۱۹) وھبہ الزحیلی، الفقہ الإسلامی وأدلتہ، ۱: ۲۲

(۲۰) زحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۱: ۱۹

(۲۱) ایضاً، ص۲۰

(۲۲) ایضاً، ص۲۰

(۲۳) زحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، ص۲۰

(۲۴) ایضاً، ص۲۱

(۲۵) الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۱: ۲۲

(۲۶) الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۱: ۲۲-۲۳

(۲۷) ایضاً، ۱: ۲۳

(۲۸) الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۱: ۲۳

(۲۹) ایضاً

(۳۰) الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۱: ۲۴

(۳۱) الفقہ الاسلامی وادلتہ، ۱: ۲۴

(۳۲) ایضاً، ۲۷

(۳۳) اللحام، وہبہ الزحیلی، ۹۸

حالتِ جنگ میں انسانی حقوق کی پاسداری

(اسلامی تعلیمات کی انفرادیت)

☆ رابعۃ الصالحہ

☆☆ ضیاء المصطفی مکی الازہری

ABSTRACT

Islam preserves the golden rules for the protection and welfare of humanity. The mutual respect for rights is the basic soul of human society as per the injunctions of Islam. The apprehension of human rights is a highly discussed issue in the current century. While, the accomplishment of it is proclaimed as a scale to measure advancement of national and cultural standards of any human civilization in the world. Islam is the only civilization of the world for which it has never been a new notion. The notion of Islam in respect of human rights is basically grounded on the rules of respect, dignity and equality. Almighty Allah has granted reverence to the whole mankind in the Holy Quran. The Holy Prophet Muhammad ﷺ has not only defined the rights of Muslims in his teachings, but also has described the rights of all humanity. As, he has determined the rights of enemy in the times of war as well as the rights of inferior towards superior. It is also the acknowledged essence of Islam that more rights of inferior have been elaborated in respect of superior, while describing more duties of the superior simultaneously in the society. The research paper aims to explicate the human rights recognized by Islam. At first instance, the notion of Islam in respect of human rights will be presented. Further, the rights of minorities in the Islamic state and the rights of enemy in the times of war will be discussed thoroughly. The paper will lead to disseminate the religious awareness in respect of human rights in the society. It will be an advantageous step for establishing a peaceful society.

Keywords: human rights, rights of minorities, human rights during war

اسلام نے انسانیت کی بقاء اور فلاح و بہبود کے اعلیٰ ترین اصول بیان کئے ہیں۔ انسانی معاشرے میں ایک دوسرے کے حقوق کا احترام اور تحفظ اسلام کی تعلیمات کی بنیاد ہے۔ انسانی حقوق دورِ جدید کا اہم ترین موضوع ہے۔ آج

☆ پی ایچ ڈی سکالر، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

☆☆ لیکچرار شعبہ اسلامک سٹڈیز، منہاج یونیورسٹی، لاہور

اسلام نے انسانیت کی بقاء اور فلاح و بہبود کے اعلی ترین اصول بیان کئے ہیں۔ انسانی معاشرے میں ایک دوسرے کے حقوق کا احترام اور تحفظ اسلام کی تعلیمات کی بنیاد ہے۔ انسانی حقوق دورِ جدید کا اہم ترین موضوع ہے۔ آج جدید دنیا میں انسانی تہذیب کے اعلی معیار کا پیمانہ انسانی حقوق کو قرار دیا جاتا ہے جس سے کسی بھی قوم اور ریاست کے تہذیبی معیار کا تعین کیا جاتا ہے۔ دینِ اسلام دنیا کی وہ واحد تہذیب ہے جس میں حقوقِ انسانی کوئی نیا تصور نہیں۔

انسانی حقوق کے بارے میں اسلام کا تصور بنیادی طور پر تمام انسانیت کے احترام، توقیر اور مساوات کے اصولوں پر بنیاد رکھتا ہے۔ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں تمام بنی نوع انسانی کو تکریم عطا کی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں فقط مسلمانوں کے حقوق بیان نہیں فرمائے بلکہ آپ نے ہمیشہ علی الاطلاق انسانیت کے حقوق کی تعلیمات دیں۔ حتی کہ حالت جنگ میں دشمنوں کے حقوق بیان فرمائے۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ اعلی کے مقابلے میں ادنی کے حقوق بیان کئے۔ یہ ہی اسلام میں انسانی حقوق کی اساس ہے کہ اسلام ہر شعبہ ہائے زندگی میں اعلی کے مقابلے میں ادنی کے زیادہ حقوق بیان کرتا ہے جبکہ اعلی کے فرائض زیادہ ہوتے ہیں۔

مقالہ کے عنوان کے مطابق پہلے حالت امن میں انسانی حقوق کا تصور، پھر اسلامی ریاست میں غیر مسلمین کے حقوق اور پھر حالت جنگ میں انسانی حقوق کے مذہبی تصور پر قرآن و سنت کی روشنی میں دلائل پیش ہیں۔

حقوق انسانی کے معنی: یہ دو کلموں کا مرکب ہے۔

حقوق: یہ حق کی جمع ہے: یعنی وہ امر جو ثابت ہو (کسی فرد یا گروہ کیلئے)۔

انسانی: انسان کی طرف منسوب ہے، انسان وہ جاندار جو جسم و روح کے ساتھ ہو اور قادرالکلام ہو۔

حقوق انسانی کا مفہوم: اس دنیا میں انسان کا باقی لوگوں سے کٹ کر تنہا رہنا ممکن نہیں۔ ہر انسان دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے پر مجبور ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور مصائب وغیرہ کے ازالہ کے لئے ہر انسان دوسرے انسان کا محتاج ہے۔ اسی قضیہ کی وجہ سے معاشرے میں موجود ہر انسان کا عقلی و طبعی فرض بنتا ہے کہ وہ دوسرے کی مدد کرے اور اس کے حقوق کا خیال رکھے۔

حالت امن میں انسانی حقوق کا مذہبی تصور

اسلام کا عطا کردہ تصور حقوق فقط رسمی نہیں بلکہ اپنی موثریت کے اعتبار سے اس قدر جامعیت اور ہمہ گیریت کا حامل ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں۔ اسلام نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل میں بہترین انسانی حقوق عطا کئے۔ ذیل میں قرآن کریم اور رسول اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ کی روشنی میں انسانی حقوق پیش

ہیں۔ قرآن و سنت میں زندگی کے ہر گوشہ سے متعلق حقوق درج ہیں۔ لیکن اختصار کے پیش نظر اگر ہم ان حقوق کو بیان کرنا چاہیں تو ان میں نمایاں حقوق درج ذیل ہیں۔

۱۔ تکریم انسانی ۲۔ مساوات ۳۔ اخوت ۴۔ عدل ۵۔ حق رائے آزادی
۶۔ معاشی حقوق

۱- تکریم انسانی

جملہ انسانی حقوق کا دارومدار درحقیقت ایک دوسرے کی تعظیم و تکریم پر ہے۔ اسی لئے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں علی الاطلاق ارشاد فرمایا؛

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾[1]

"اور بیشک ہم نے بنی آدم کو تکریم بخشی اور ہم نے انہیں خشکی اور تری میں سوار کیا، اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق عطا کیا اور ہم نے انہیں کثیر مخلوق پر فضیلت دی جنہیں ہم نے پیدا کیا۔"

یہ آیت کریمہ واضح دلالت کر رہی ہے کہ معاشرے میں رہنے والے فقط اہل اسلام ہی عزت کے قابل نہیں بلکہ معاشرے کا ہر فرد، ہر انسان تکریم کے لائق ہے۔ اللہ تعالی نے تمام انسانوں کو تکریم عطا کی ہے۔ دوسرا حق اس میں اللہ تعالی نے واضح بیان فرمایا کہ ہر انسان کو آزادی ہے کہ وہ خشکی و تری میں سفر کرے، دنیا میں پائی جانے والی حلال اشیاء کسی خاص مذہب یا افراد کی ملکیت نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے ہیں گویا کہ رزق کا حق واضح عطا فرمایا اور آیت کے آخر میں اللہ کریم نے پھر تمام انسانوں کو باقی تمام مخلوقات پر فضیلت عطا فرمادی۔ آیت کے الفاظ اظہر من الشمس ہیں کہ یہ فضیلت تمام انسانوں کے لئے ہے، کسی خاص مذہب یا طبقہ کے لئے نہیں۔

ان تعلیمات کا اثر ہی تھا کہ عرب جیسا معاشرہ پر امن ہو گیا۔ کوئی کسی پر انگلی نہ اٹھاتا حتی کہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو (جو پہلے حبشی غلام تھے) مؤذن مقرر کیا گیا۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان ان کی بھی ایسے ہی عزت و تکریم کرتے جیسے کسی آزاد عربی النسل کی کرتے۔

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل، ۱۷/۷۰

۲-مساوات

تکریم انسانی کی تعلیم کا نتیجہ معاشرے میں مساوات ہے۔اسلام کے بیان کردہ تکریم انسانی کے حق سے معاشرے میں مساوات پیدا ہوئی۔ زندگی کے ہر گوشہ میں چاہے انفرادی ہو یا خانگی، عائلی ہو یا قانونی، مساوات انسانی کے حق کو نافذ کرنا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے تکریم انسانیت کی اساس بیان کرتے ہوئے واضح فرمادیا؛

''يا أيها الناس ألا إن ربكم واحد وإن أباكم واحد ألا لا فضل لعربي على أعجمي ولا لعجمي على عربي ولا لأحمر على أسود ولا أسود على أحمر إلا بالتقوى''(۱)

"اے لوگو! خبردار بے شک تمہارا رب ایک ہے، اور بے شک تمہارے والد ایک ہیں، خبردار! کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سرخ کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی سرخ پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، سوائے تقوی کے۔"

۳-اخوت

اسلام سے قبل عرب کے معاشرے کی حالت ڈھکی چھپی نہیں۔ چھوٹی چھوٹی بات پر کئی کئی نسلوں تک قتل و غارت کا بازار گرم رکھنے والوں کو اسلام نے اخوت اور بھائی چارے میں بدل دیا۔ اسلام نے تمام انسانوں کو بھائی بھائی قرار دیا۔

''عن أنس قال رسول الله ﷺ: الخلق عيال الله فأحبهم إلى الله أنفعهم لعياله''(۲)

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمام مخلوق اللہ کی محتاج ہے، پس تم میں سے اللہ تعالی کو وہ زیادہ محبوب ہے جو ان کو نفع پہنچائے۔"

پھر قرآن کریم میں اللہ تعالی نے تمام مؤمنین کو بھی بھائی قرار دیا۔ فرمان باری تعالی ہے؛

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾(۳)

---

(۱) احمد بن حنبل، (س-ن)، مسند احمد بن حنبل، قاہرہ، مؤسسۃ قرطبۃ، ج:۵، ص:۴۱۱، حدیث نمبر:۲۳۵۳۶

(۲) ابو یعلی، احمد بن علی، (۱۹۸۴) المسند، دمشق، دار المامون للتراث، ج:۶، ص:۶۵، حدیث نمبر:۳۳۱۵

(۳) سورۃ الحجرات، ۴۹/۱۰

''مسلمان (آپس میں) بھائی بھائی ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''إن المؤمن للمؤمن كالبنيان، يشد بعضه بعضا'' (۱)

"ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کی مانند ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔"

اسلام کے عطا کردہ انسانی حقوق کا ہی ثمر تھا کہ ریاست مدینہ میں مواخات کے موقع پر انصار نے اپنے تمام اموال مہاجرین میں برابر تقسیم کر دیئے۔

۴ - عدل

عدل کے بغیر کوئی بھی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا اور نہ ہی بغیر عدل کے انسانی حقوق کو صحیح معنی میں نافذ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے کئی مقامات پر عدل کے قیام کا حکم دیا۔ فرمان باری تعالی ہے؛

﴿قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ﴾ (۲)

"فرما دیجئے کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔"

ایک اور مقام پر اللہ کریم نے فرمایا؛

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ﴾ (۳)

"اور ناپ تول کو انصاف سے پورا کرو۔"

قرآن نے انبیاء کو بھیجنے کا مقصد، کتابوں کے نازل کرنے کا مقصد ہی یہ بیان کیا کہ لوگ معاشرے میں امن قائم کریں۔ فرمان باری تعالی ہے؛

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾(۴)

---

(۱) بخاری، محمد بن اسماعیل، (س-ن) صحیح البخاری، بیروت، دار الفکر، ص:۱۲۸، حدیث نمبر:۴۸۲

(۲) سورۃ الاعراف، ۷/ ۱۹

(۳) سورۃ الانعام، ۶/ ۱۵۲

(۴) سورۃ الحدید، ۵۷/ ۲۵

"بے شک ہم نے اپنے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ انصاف قائم کریں۔"

یہ اسلام کا عدل ہی تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک معزز خاندان کی عورت کی چوری پر سزا دی تو اس کی سفارش کرنے والوں کی سفارش رد کر کے ارشاد فرمایا:

''وأيم الله، لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها''(۱)

"اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔"

۵ - حق رائے آزادی

جس معاشرے میں دوسرے کو اپنی رائے قائم کرنے کی اجازت نہ دی جائے، کسی کی رائے کی قدر نہ کی جائے وہ معاشرہ کبھی پروان نہیں چڑھتا۔ اسلام نے بہترین اصول کے ذریعے تمام انسانوں کو حق رائے آزادی عطا کر دیا۔ فرمان باری تعالی ہے:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾(۲)

"دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔"

حتی کہ اگر کوئی اسلام قبول نہیں کرتا، اس کو سمجھائیں، اس کو دلائل سے قائل کریں لیکن اس پر بھی جبر کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر وہ اپنے کسی بھی مذہب کو چھوڑنا نہیں چاہتا تو قرآن نے واضح فرمایا:

﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾(۳)

"تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے۔"

حتی کہ اللہ کریم نے شرک کا سب سے بڑا سبب، جھوٹے خداؤں، بتوں کو بھی گالی دینے سے منع کر دیا۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾(۱)

---

(۱) بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، (س-ن) صحیح البخاری، بیروت، دار الفکر، ص:۸۵۶، حدیث نمبر:۳۴۷۵

(۲) سورۃ آل عمران، ۳/۱۳۴

(۳) سورۃ الکافرون، ۶/ ۱۰۹

"تم ان کو گالی مت دو جن کو وہ اللہ کے علاوہ پوجتے ہیں۔"

لہذا اسلام نے واضح طور پر تمام انسانوں کو اپنی اپنی رائے قائم کرنے کا حق عطا کیا۔ کسی پر اس دنیا میں جبر نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے، اپنا مذہب، اپنا مؤقف تبدیل کرے۔ ہر شخص آزاد ہے اور ہر شخص کو آزادی رائے کا حق حاصل ہے۔

۶ - معاشی حق

اسلام دیگر حقوق کی طرح حق معیشت میں بھی مساوی حقوق کا قائل ہے۔ اسلام معاشرے کے تمام انسانوں کو اسباب معیشت سے فائدہ اٹھانے کا مساوی حق فراہم کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ﴾(۲)

"اور بیشک ہم نے تم کو زمین میں تمکّن و تصرّف عطا کیا اور ہم نے اس میں تمہارے لئے اسبابِ معیشت پیدا کئے، تم بہت ہی کم شکر بجالاتے ہو۔"

گویا اسلام نے معاشی حق بھی تمام انسانوں کو عطا کیا۔ آیت کریمہ میں یہ حق فقط مسلمانوں کو نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے بیان ہوا۔ لہذا تمام انسان اس حق میں بھی مساوی ہیں۔ کسی کو کسی صورت بھی معاشی حق سے روکا نہیں جاسکتا۔

مندرجہ بالا سطور میں اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں اختصار کے ساتھ ان نمایاں حقوق بیان ہوئے ہیں جو تمام انسانوں کے لئے ہیں۔ ان حقوق میں کوئی طبقہ، مذہب، گروہ، قوم مختص نہیں۔ ذیل میں اب وہ حقوق بیان ہوں گے جو اسلامی ریاست میں غیر مسلمین (یعنی اقلیتوں) کے حقوق ہیں۔

اسلامی ریاست میں اقلیت (غیر مسلمین) کے حقوق

اسلامی ریاست میں رہنے والے تمام شہری برابر ہیں۔ سب کے فرائض و حقوق مساوی ہیں۔ اسلام ہر اعتبار سے اسلامی ریاست میں رہنے والے اقلیت شہریوں کو تحفظ اور حقوق فراہم کرتا ہے۔ اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے نمایاں حقوق درج ذیل ہیں۔

---

(۱) سورۃ الانعام، ۱۰۸/ ۶

(۲) سورۃ الاعراف، ۷/ ۱۰

۱. اقلیت شہریوں کے قتل کی ممانعت
۲. غیر مسلم سفیروں کا حق زندگی
۳. غیر مسلم مذہبی رہنماؤں کی زندگیوں کا تحفظ
۴. غیر مسلمین کے جان، مال، زمینوں کا تحفظ
۵. غیر مسلمین کی تذلیل ممنوع ہے
۶. غیر مسلم (اسلامی ریاست میں رہنے والے اقلیت شہری) کی حفاظت کی خاطر اسلامی فوج کو جنگ کا حکم
۷. اقلیتوں کو اپنے مذہب کی مکمل آزادی

اقلیت شہریوں کے قتل کی ممانعت

اسلامی ریاست میں رہنے والی اقلیتوں کے کسی بھی باشندے کو بغیر کسی ایسے جرم کے جس پر سزائے موت ہو، قتل کرنا منع ہے۔ اسلام نے ہر انسان کو زندگی کا حق دیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾ (۱)

جس نے کسی بھی انسان کو بغیر قصاص کے یا فساد فی الارض کے قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کا قتل کیا۔

اس آیت کریمہ میں نفس کا کلمہ مطلق ہے۔ معنی انسان۔ اس میں معاشرے میں رہنے والا ہر فرد چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم سب شامل ہیں۔ لہذا اللہ کریم نے اس آیت کریمہ کے ذریعے تمام انسانوں کو زندگی کا حق عطا کیا ہے، یہ حق چھینا نہیں جا سکتا۔

حدیث مبارکہ میں ہے:

''من قتل معاهد في غير كنهه، حرم الله عليه الجنة''(۲)

جس نے کسی معاھد کو ناحق قتل کر دیا اللہ تعالی اس پر جنت حرام فرما دے گا۔

گویا اسلام نے معاشرے میں رہنے والے ہر فرد کو زندگی کا حق برابر دیا ہے۔ کسی کی زندگی کو کوئی چھین نہیں سکتا۔

---

(۱) سورۃ المائدۃ، ۵/ ۳۲

(۲) نسائی، ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب، (۲۰۰۵ء)، السنن، بیروت، دار الفکر، ص: ۱۱۰۱، حدیث نمبر: ۴۷۵۶

غیر مسلم سفیروں کا حق زندگی

اسلام نے ہمیشہ اخوت اور رواداری کا درس دیا ہے۔ غیر مسلم سفیر جو اسلامی ریاست میں غیر مسلم ممالک سے آئیں تو ان کی زندگیوں کا تحفظ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ حتی کہ اگر کوئی غیر مسلم شخص کسی بدترین دشمن کی طرف سے بھی سفیر بن کر آجائے تب بھی اس کی زندگی کا تحفظ کیا جائے گا کیونکہ اس وقت وہ سفیر ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، جب یہ شخص (عبد اللہ بن نواحہ) اور ایک دوسرا شخص مسیلمہ (نبوت کا جھوٹا دعویدار) کی طرف سے سفیر بن کر آئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم دونوں اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ انہوں نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے (معاذ اللہ)۔ آقا کریم ﷺ نے فرمایا: میں اللہ تعالی اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتا ہوں۔ اگر میں سفیروں کو قتل کرنے والا ہوتا تو تم دونوں کو قتل کر دیتا۔[1]

لہذا رسول اللہ ﷺ نے بدترین دشمن، نبوت کے جھوٹے دعویدار کے سفیر کی زندگی کو بھی تحفظ دیا اور اسے قتل نہیں کیا اور واضح فرما دیا کہ اگر میں سفیروں کو قتل کرنے والا ہوتا۔ گویا کہ رسول اللہ ﷺ سفیروں کو قتل کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔

غیر مسلم مذہبی راہنماؤں کی زندگیوں کا تحفظ

غیر مسلم مذہبی راہنماؤں کو تو حالت جنگ میں بھی قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے لشکروں کو روانہ کرتے تو انہیں حکم فرماتے:

"غداری نہ کرنا، دھوکہ نہ دینا، لعشوں کی بے حرمتی نہ کرنا، بچوں اور پادریوں کو قتل نہ کرنا"[2]

رسول اللہ ﷺ نے واضح الفاظ میں یہاں تک ارشاد فرما دیا کہ دشمن کی لعش کی حالت جنگ میں بھی بے حرمتی جائز نہیں۔ گویا کہ اسلام کا جہاد فقط ان سے ہے جو مد مقابل ہیں، اور جب کوئی شخص گر گیا، قتل ہو گیا تو اب اس کی لعش کی بے حرمتی بھی نہیں کر سکتے اگرچہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

---

[1] دارمی، ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمن، (۲۰۰۰ء)، السنن، سعودی عرب، دار المغنی، ج:۳، ص:۱۶۲۶، حدیث نمبر:۲۵۴۵

[2] احمد بن حنبل، (س-ن)، المسند، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، ج:۲، ص:۲۷۰، حدیث نمبر:۲۷۲۸

غیر مسلمین کے جان، مال، زمینوں کا تحفظ

اسلامی ریاست میں اقلیت (غیر مسلمین) کے مال و دولت کی حفاظت کی جائے گی۔ امام ابو یوسف نے نجران کے عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے معاہدے کی یہ شق بیان کی:

''ذمة محمد النبي رسول الله ﷺ على أموالهم وأنفسهم وأرضهم وملتهم وغائبهم وشاهدهم وعشيرتهم وبيعهم وكل ما تحت أيديهم من قليل أو كثير ''(۱)

"اللہ کے رسول محمد ﷺ اہل نجران اور ان کے حلیفوں کے لئے ان کے مالوں، ان کی جانوں، ان کی زمینوں، ان کے دین، ان کے غیر موجود و موجود افراد، ان کے خاندان کے افراد، ان کی عبادت گاہوں، اور جو کچھ بھی ان کے ہاتھوں میں ہے، کم یا زیادہ، ہر چیز کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔"

اس معاہدے کے ذریعے رسول اللہ ﷺ نے ہر اس شخص کو جو اسلامی ریاست سے معاہدہ کرے، اسلامی ریاست کو نقصان نہ پہنچائے، اس کی جان، مال، گھر، زمین، عبادت گاہ حتی کہ کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا۔ آج کسی بھی مسلم ملک میں یہ مسلمان حکومت کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اقلیتوں کی جان، مال، عزت، گھر، زمین، عبادت گاہ، ہر چیز کی حفاظت کرے۔

کسی اقلیت کے نزدیک اگر خنزیر یا شراب جائز ہو تو ریاست میں رہنے والے کسی بھی مسلمان کو اجازت نہیں کہ وہ خنزیر یا شراب کو تلف کرے۔ اگر کوئی کرے گا تو اس سے تاوان لیا جائے گا۔ در مختار میں ہے:

''يضمن المسلم قيمة خمره وخنذيره إذا أتلفه'' (۲)

"(کوئی بھی مسلم شہری) غیر مسلم شہری کی شراب اور اس کے خنزیر کو تلف کرنے کی صورت میں اس کی قیمت تاوان کے طور پر ادا کرے گا۔"

گویا کہ اسلامی حقوق میں غیر مسلمین کی وہ چیزیں جو اسلام کے نزدیک جائز بھی نہیں، ان کو نقصان پہنچانا بھی ممنوع ہے۔ غیر مسلم اپنے افعال و اعمال میں ہر طرح آزاد ہیں۔

---

(۱) ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، (س-ن)، کتاب الخراج، قاہرہ، المکتبہ الازھریہ، ص:۸۵

(۲) حصکفی، محمد بن علی بن محمد، (۱۳۸۶ھ)، الدر المختار، بیروت، دار الفکر، ج:۴، ص:۱۷۰

غیر مسلمین کی تذلیل ممنوع ہے

جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا کہ اسلامی ریاست میں ہر انسان کی تکریم اس کا حق ہے۔ اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلمین کے حقوق ایسے ہی ہیں جیسے مسلمانوں کے حقوق ہیں۔

ایک بار گورنرِ مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے ایک غیر مسلم شخص کو ناحق سزا دے دی۔ اس دور کے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت آئی تو آپ نے سرعام گورنرِ مصر کے بیٹے کو اس فعل پر سزا دلوائی اور تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

''مذ کم تعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا''(۱)

"تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام سمجھ لیا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنم دیا؟"

الدر المختار میں ہے:

''يجب كف الأذى عنه''(۲)

"غیر مسلم کو اذیت سے محفوظ رکھنا واجب ہے"۔ یعنی کسی غیر مسلم کو جو اسلامی ریاست میں رہتا ہو، اسلامی ریاست کو ٹیکس ادا کرتا ہو، اس سے ہر طرح کی اذیت اور تکلیف کو دور کرنا لازم ہے۔ الدر المختار میں ہے کہ:

''وتحرم غيبته كالمسلم''(۳)

"اور اس کی غیبت کرنا بھی ایسے ہی حرام ہے جیسے کسی مسلمان کی غیبت کرنا حرام ہے۔"

غیر مسلم (اسلامی ریاست کے اقلیت شہری) کی حفاظت کی خاطر اسلامی فوج کو جنگ کا حکم

امام قرافی لکھتے ہیں:

''وجب علينا أن نخرج لقتالهم بالكراع والسلاح ونموت دون ذلك''(۴)

---

(۱) ہندی، علاء الدین علی بن حسام الدین، (۱۹۸۱ء)، کنز العمال، مؤسسۃ الرسالۃ، ج:۱۲، ص:۶۶۰، حدیث نمبر:۳۶۰۱۰

(۲) ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، (۱۹۹۲ء)، رد المحتار علی الدر المختار، بیروت، دار الفکر، ج:۴، ص:۱۷۰

(۳) حصکفی، محمد بن علی بن محمد، (۱۳۸۶ھ)، الدر المختار، بیروت، دار الفکر، ج:۴، ص:۱۷۰

(۴) قرافی، ابو العباس، احمد بن ادریس، (۱۹۹۸ء)، الفروق وانوار البروق فی انوار الفروق، دار الکتب العلمیہ، ج:۳، ص:۲۹

"ہماری اسلامی ریاست پر لازم ہے کہ وہ اسلحہ اور لشکر کے ساتھ غیر مسلمین (ریاست میں بسنے والے) کی حفاظت کے لئے جنگ کرے چاہے اپنے سپاہی شہید ہو جائیں۔"

گویا کہ اسلامی ریاست میں بسنے والے شہری مسلمانوں کی طرح ہیں۔ ان کی حفاظت کی خاطر اسلامی ریاست کی افواج پر جنگ بھی لازم ہے اگرچہ مسلمان سپاہی شہید ہو جائیں لیکن اقلیت کا تحفظ بہر حال کیا جائے گا۔

اسلامی ریاست میں رہنے والی اقلیتوں کو اپنے مذہب کی مکمل آزادی کا حق

شریعت اسلامیہ نے اسلامی ریاست میں رہنے والے ہر شہری کو اپنی مرضی کے مذہب پر عمل کرنے کا سو فیصد حق دیا ہے۔ مسلمان اسلام کی تبلیغ تو کر سکتے ہیں، کسی غیر مسلم کو سمجھا تو سکتے ہیں لیکن کسی پر جبر کر کے اسے مسلمان نہیں کر سکتے۔ کسی کو کسی صورت بھی مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ مسلمان ہو۔ اللہ کریم نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

﴿أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (1)

"تو کیا آپ لوگوں پر جبر کریں گے یہاں تک کہ وہ مومن ہو جائیں۔"

گویا کہ اللہ کریم نے کسی کو زبردستی اسلام میں داخل کرنے سے منع فرما دیا۔ ہر شخص کو اپنے مذہب کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ تاریخ میں کبھی اسلامی ریاست نے کسی شہری پر مذہبی جبر نہیں کیا۔ حتی کہ یورپین رائٹرز بھی اس بات کو قبول کرتے ہیں۔ پروفیسر ہٹی (Philip K. Hitti) لکھتے ہیں:

"They (non-muslims) were allowed the jurisdiction of their own canon laws as administered by the respective heads of their religious communities. This state of partial autonomy, recognized later by the Sultans of Turkey, has been retained by the Arab successor states."(2)

"غیر مسلم شہریوں کو اجازت تھی کہ وہ اپنی مذہبی کمیونٹیز کے سربراہان کے نظام کے تحت اپنے مذہبی قوانین کے مطابق اپنے معاملات چلائیں۔ یہ جزوی خود مختاری، جسے عرب کی جانشین ریاستوں نے برقرار رکھا تھا، ترکی سلاطین (سلطنت عثمانیہ) نے بھی تسلیم کی تھی۔"

---

(1) سورۃ البقرہ، ۲/۲۵۶

(2) Hitti, Philip K, (1970), History of the Arabs, Tenth Edition, London, Macmillan Education Ltd, Page: 170

مندرجہ بالا بحث سے یہ امر اظہر من الشمس ہوا کہ غیر مسلمین اقلیتوں کو اسلامی ریاست میں وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ وہ اپنی تعلیم، عبادت، زندگی، اعمال، افعال میں ہر طرح سے آزاد ہیں۔ ان کو ہر طرح کی آزادی میسر ہے۔ حتی کہ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ عیسائی اپنی صلیب نکال سکتے ہیں۔ ہماری نماز پنجگانہ کے علاوہ وہ جب چاہیں اپنا ناقوس بجاسکتے ہیں۔(۱)

اسلام کے ان حقوق کی بدولت ہی عیسائی اسلامی ریاست میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔Montgomery Watt لکھتا ہے:

"The Christians were probably better off as dhimmis under Muslim Arab rulers than they had been under the Byzantine Greeks"(2)

"عرب مسلم حکمرانوں کے دور میں عیسائی بطور غیر مسلم شہری یونانی اور بازنطینی حکمرانوں کی رعیت میں رہنے سے مسلم عرب حکمرانوں کی رعیت میں رہنا زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔"

مندرجہ بالا سطور اس امر پر روز روشن کی طرح عیاں ہیں کہ اسلام نے اسلامی ریاست میں انسانوں کے لئے جو حقوق بیان فرمائے وہ فقط مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں ہیں بلکہ اسلامی ریاست میں رہنے والا کوئی بھی فرد ہر طرح کا حق رکھتا ہے۔

حالت جنگ میں انسانی حقوق

شریعت اسلامیہ میں جنگ بطور دفاع ہے۔ یعنی کسی ایسے فرد، گروہ، قوم اور ملک کے ساتھ جنگ نہیں ہو گی جو اسلام، اسلامی ریاست، مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچاتا ہو۔ کسی بھی قوم کی حد درجہ دشمنی کے باوجود اسلام اجازت نہیں دیتا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑا جائے۔ اسلام نے کسی قوم کی سخت دشمنی میں بھی اس سے عدل کرنے کا حکم دیا۔ فرمان باری تعالی ہے:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾ (۳)

---

(۱) ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، (س-ن) کتاب الخراج، قاہرہ، المکتبہ الازھریہ، ص: ۱۵۷

(2) Watt, W. Montgomery, (1968) Islamic Political Thought The Basic Concepts, Edinburgh, Scotland, Edinburgh University Press, Page 51

(۳) سورۃ المائدۃ، ۸/۵

اور کسی قوم کی سخت دشمنی تمہیں اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کیا کرو، وہ پرہیز گاری سے نزدیک ترین ہے۔

گویا کہ اللہ کریم نے واضح اصول بیان فرما دیا کہ کسی قوم سے تمہاری دشمنی ہے، سخت اختلافات ہیں، اس کے باوجود اس قوم کے ساتھ کسی بھی معاملے میں عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ یہ اسلام کا ہی حسن ہے کہ اسلام کسی مخالف سے حالت دشمنی میں بھی عدل کا حکم دیتا ہے۔ کسی قوم سے جنگ ہو رہی ہے تو اس جنگ میں بھی عدل ضروری ہے۔ یہ جائز نہیں کہ مسلمان ان افراد کا قتل عام شروع کر دیں جو مسلمانوں کے خلاف نکلے ہی نہیں۔

عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت

اسلام نے حالت جنگ میں بھی دشمن کی عورتوں کو قتل کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

''وجدت امراءة مقتولة في بعض مغازی رسول الله ﷺ ، فنهی رسول الله ﷺ عن قتل النساء والصبيان''(۱)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ کسی غزوہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کو دیکھا جسے قتل کیا گیا تھا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے روک دیا۔

لہذا اسلامی کی تعلیمات کی روشنی میں دشمن کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا بھی جائز نہیں۔ شاید ہی دنیا کا کوئی اور مذہب ہو جو دشمن سے جنگ کے دوران بھی دشمن کے حقوق کا تحفظ کرے۔

امام مسلم نے صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک خط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے لکھا:

''وإن رسول الله ﷺ لم يكن يقتل الصبيان، فلا تقتل الصبيان''(۲)

"بے شک رسول اللہ ﷺ دشمن کے بچوں کو قتل نہیں کرتے تھے، لہذا تم بھی بچوں کو قتل نہ کرنا۔"

---

(۱) بخاری، محمد بن اسماعیل، (س-ن)، الصحیح، بیروت، دار الفکر، ص:۷۳۶، حدیث نمبر:۳۰۱۵

(۲) مسلم، مسلم بن الحجاج، (۲۰۰۳ء)، الصحیح، بیروت، دار الفکر، ص:۹۲۱، حدیث نمبر:۴۵۷۷

کسی صورت بھی دشمن کے بے گناہ بچوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ جواز بھی پیش نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہمارے شہریوں کو مار رہے ہیں تو ہم ان کے شہریوں کو ماریں گے۔ اس کو جواز بنا کر دشمن کے بے گناہ شہریوں کو قتل کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیمات کے مطابق جنگ فقط اسی سے ہو گی جو اسلام کے مقابلے میں آئے گا اور حملہ کرے گا۔

دشمن کے ضعیف لوگوں کو قتل کرنے کی ممانعت

اسلام ہر گز اجازت نہیں دیتا کہ دشمن کے ضعیف اور بوڑھے لوگوں کو بلاوجہ و بلا جواز قتل کر دیا جائے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ولا تقتلوا شيخا فانيا، ولا طفلا، ولا صغيرا، ولا امراءة'' (۱)

"نہ کسی بوڑھے کو قتل کرو، نہ شیر خوار بچے کو، نہ نابالغ کو اور نہ عورت کو قتل کرو۔"

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلمین کے مذہبی راہنماؤں کی جانوں کو بھی تحفظ عطا کیا اور انہیں بلاجواز قتل کرنے سے منع فرمایا۔

غیر مسلم مذہبی راہنماؤں کو قتل کرنے کی ممانعت

امام ابن ابی شیبہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ لشکر کو روانہ فرماتے تو اسے یہ ہدایت کرتے:

''لا تقتلوا أصحاب الصوامع '' (۲)

"چرچوں کے پادریوں کو قتل نہ کرنا۔"

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی واضح حکم دیا:

''الا! لا يقتل الراهب في الصومعته''(۳)

---

(۱) ابو داود، سلیمان بن اشعث السجستانی، (۲۰۰۵ء)، السنن، بیروت، دار الفکر، ص:۴۸۸، حدیث نمبر:۲۶۱۴

(۲) ابن ابی شیبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد، (۱۴۰۹ھ)، المصنف، ریاض، مکتبہ الرشد، ج:۶، ص:۴۸۴، حدیث نمبر:۳۳۱۳۲

(۳) ابن ابی شیبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد، (۱۴۰۹ھ)، المصنف، الریاض: مکتبہ الرشد، ج:۶، ص:۴۸۳، حدیث نمبر::۳۳۱۲۷

"خبر دار!عبادت گاہوں میں پادریوں کو قتل نہ کیا جائے۔"

یہ اسلام کا ہی خاصہ ہے کہ حالت جنگ میں دشمن کے حقوق کا خیال رکھتا ہے۔ جو مقابلے میں نہیں ہے، جو بے گناہ ہے انہیں قتل کرنے سے منع کرتا ہے۔ حتی کہ وہ لوگ جو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں غلط ہیں اور غلط مذہب کی تبلیغ کرنے والے ہیں، ان کو بھی قتل کرنے سے منع کرتا ہے۔ ان کی جانوں کو تحفظ دیتا ہے۔

دشمن کے تاجروں، مال معیشت، عمارتوں اور رہائشی گھروں کو نقصان نہ پہنچانے کا حکم

جہاں دشمن کی عورتوں، بچوں، ضعیف لوگوں، مذہبی راہنماؤں کو بلاجواز قتل کرنے کی ممانعت ہے۔ وہیں اسلام نے یہ اصول بھی مرتب کیا اور دشمن کو حالت جنگ میں بھی یہ حق دیا کہ اسلامی افواج دشمن کے تاجروں کو بلاجواز قتل نہیں کر سکتیں۔ مسلمانوں کا فرض اور دشمن کا حق ہے کہ دشمن کے مال معیشت کو بلاجواز نقصان نہ پہنچایا جائے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

''كانوا لا يقتلون تجار المشركين''(۱)

"مسلمان مشرک تاجروں کو قتل نہیں کرتے تھے۔"

لہذا اسلامی افواج کو اجازت نہیں ہو گی کہ دشمن کے تاجروں، بزنس مینز کو بلاجواز قتل کر دیں۔ اسی طرح اسلام نے دشمن کے مال معیشت کو بھی نقصان پہنچانے سے منع فرمایا ہے۔ دشمن کی فصلیں، اجناس، کوئی بھی تجارتی مال جو اسلام کے خلاف استعمال نہیں ہو رہا، اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''ونهى أبو بكر الصديق أن يقطع شجرا مثمرا أو يخرب عامرا، وعمل بذلك المسلمون بعده''(۲)

"حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے (جنگ کے دوران) پھل دار درخت کاٹنے، عمارت کو تباہ کرنے سے منع فرمایا اور آپ کے بعد بھی مسلمان اسی پر عمل کرتے رہے۔"

اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شام کی طرف لشکر بھیجنے کے موقع پر نصیحت فرمائی کہ:

---

(۱) ابن ابی شیبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد، (۱۴۰۹ھ)، المصنف، ریاض، مکتبہ الرشد، ج:۶، ص:۴۸۴، حدیث نمبر:۳۳۱۳۰

(۲) الترمذی، ابو عیسی، محمد بن عیسی، (۲۰۰۵ء)، السنن، بیروت، دار الفکر، ص:۴۷۹، حدیث نمبر:۱۵۵۷

''إني أوصيك بعشر لا تقتلن صبيا ولا امرأة ولا كبيرا هرما ولا تقطعن شجرا مثمرا ولا تخربن عامرا ولا تعقرن شاة ولا بعيرا إلا الماكلة ولا تغرقن نخلا ولا تحرقنه ولا تغلل ولا تجبن''(۱)

"میں تمہیں دس چیزوں کی وصیت کرتا ہوں کہ کسی بچے، عورت، بوڑھے اور بیمار کو قتل نہ کرنا، اور نہ ہی پھل دار درخت کاٹنا، اور نہ ہی کسی آباد گھر کو ویران کرنا، اور نہ ہی کسی بھیڑ اور اونٹ کی کونچیں کاٹنا مگر کھانے کے لئے اور کھجوروں کے پوروں کو مت کاٹنا اور نہ ہی انہیں جلانا اور مال غنیمت تقسیم کرنے میں دھوکہ نہ کرنا اور بزدل نہ ہونا۔"

اگر ہم سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اس نصیحت پر غور کریں تو اس میں آپ نے کسی بھی صورت مال تجارت اور مال معیشت کو نقصان دینے سے منع فرمایا۔ اسلامی فوج کی جنگ فقط ان سے ہے جو مقابلے میں آکر حملہ کر دیں۔ مسلمان ان کی عمارتوں کو نقصان نہیں پہنچاسکتے، ان کے تاجروں کو قتل نہیں کر سکتے، مال معیشت کو نقصان نہیں پہنچاسکتے۔ ان کے رہائشی گھر تباہ نہیں کر سکتے۔

غزوہ خیبر کی روایات میں آتا ہے کہ:

''فاسرع الناس في حظائر يهود فأمرني أن أنادي الصلاة جامعة ولا يدخل الجنة إلا مسلم ثم قال أيها الناس أنكم قد أسرعتم في حظائر يهود الا لا تحل أموال المعاهدين إلا بحقها''(۲)

مجاہدین جلدی میں یہود کے بندھے ہوئے جانور (یعنی وہ جانور جو جنگ میں استعمال نہیں ہوئے اور مال غنیمت کی تعریف میں داخل نہیں تھے بلکہ عامۃ الناس کے بندھے ہوئے جانور تھے) لے گئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو نماز کے لئے آذان دینے کا حکم دیا۔ نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم جلدی میں یہود کے بندھے ہوئے جانور بھی لے گئے ہو۔ خبر دار سوائے حق (مال غنیمت) کے غیر مسلم شہریوں کے اموال لینا حلال نہیں۔

---

(۱) ابن ابی شیبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد، (۱۴۰۹ھ)، مصنف ابن ابی شیبہ، ریاض، مکتبہ الرشد، ج:۶، ص:۴۸۳، حدیث نمبر:۳۳۱۲۱

(۲) احمد بن حنبل، (س-ن)، المسند، قاہرہ، مؤسسۃ قرطبۃ، ج:۴، ص:۸۹، حدیث نمبر:۱۶۸۶۲

گویا کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں جنگ کے دوران یا جنگ کے بعد بھی غیر مسلم شہری جو مقابل نہیں آئے، ان کے اموال پر قبضہ کرنا، انہیں نقصان پہنچانا جائز نہیں۔ اسلام نے حالت جنگ میں بھی دشمن کو معاشی حقوق عطا کئے ہیں۔ دشمن کی معیشت کا خیال رکھا ہے۔ مسلم افواج کی جنگ انسانیت سے نہیں ہوتی بلکہ ایسے شخص سے ہوتی ہے جو اسلام میں رکاوٹ ڈالے یا اسلامی ریاست و حکومت کو نقصان پہنچائے یا اسلامی ریاست میں رہنے والے کسی بھی شہری چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو اسے نقصان پہنچائے۔ اسی لئے اسلام نے دوران جنگ بھی دشمن کے شہریوں کے ہر طرح کے حقوق کا خیال رکھا ہے۔ انہیں کسی بھی قسم کا نقصان پہنچانے سے منع کیا ہے۔

حالت جنگ میں غیر محارب غیر مسلمین کو نقصان پہنچانے کی ممانعت

حضور نبی اکرم ﷺ نے دوران جنگ بھی دشمن کے شہریوں کو ناحق قتل کرنے کی ممانعت فرمائی۔ مندرجہ بالا سطور میں یہ واضح ہوا کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور مذہبی راہنماؤں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ذیل میں شریعت اسلامیہ کے تحت ان نصوص کا ذکر ہے جن میں واضح فرمایا گیا کہ جو شخص مسلم فوج کے ساتھ مقابلے میں نہیں آیا اسے بھی قتل کرنا منع ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ اس کی بہترین عملی نظیر فتح مکہ ہے جب رسول اللہ ﷺ نے واضح ارشاد فرمایا:

''من دخل دار أبي سفيان فهو آمن، و من ألقى السلاح فهو آمن، ومن أغلق بابه فهو آمن''(۱)

"جو شخص ابوسفیان کے گھر داخل ہو گیا وہ امان میں ہے، جس نے اسلحہ پھینک دیا وہ امان میں ہے، اور جس نے اپنا دروازہ بند کر لیا وہ امان میں ہے۔"

گویا رسول اللہ ﷺ نے خود فرما دیا کہ جو دروازہ بند کر لے، مسلم فوج کے مقابل نہ آئے اسے قتل کرنا یا نقصان پہنچانا تو دور بلکہ وہ مکمل امان میں ہے۔ اس کی زندگی، مال، دولت، گھر سب کو تحفظ حاصل ہے۔

حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

''لا يتبع مدبر'' (۲)

---

(۱) مسلم، مسلم بن الحجاج القشیری، (۲۰۰۳ء) صحیح مسلم، بیروت، دار الفکر، ص:۹۰۰، حدیث نمبر:۴۵۱۴

(۲) صنعانی، ابو بکر عبد الرزاق بن ہمام، (۱۴۰۳ھ)؛ المصنف، ہندوستان، المجلس العلمی، ج:۱۰، ص:۱۲۳، حدیث نمبر:۱۸۵۹۰

"کسی بھاگنے والے کا تعاقب مت کرو۔"

گویا کہ جو میدان جنگ سے بھی جنگ چھوڑ کر بھاگ گیا ہے، اسلحہ پھینک دیا ہے اب اس کو قتل کرنا تو دور اس کا تعاقب کرنا بھی منع ہے۔

یہ اسلام کی ہی تعلیمات ہیں کہ دشمن کو حالت جنگ میں اس قدر حقوق عطا کرتا ہے۔ دشمن کی جان، مال، عزت، گھر، عبادت گاہیں، مذہبی راہنماء، معیشت، عورتوں، بچوں کا تحفظ کرتا ہے۔ شاید ہی دنیا کے کسی مذہب میں دشمن کے لئے اتنے حقوق بیان ہوئے ہوں۔ اسلام وہ واحد دین ہے جو فقط مسلمانوں کو نہیں بلکہ انسانیت کو حقوق عطا کرتا ہے۔

خلاصہ بحث

مندرجہ بالا بحث سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے، نکات کی صورت میں ذیل پیش ہے؛

۱۔ اسلام ایسا واحد دین ہے جو انسانیت اور انسانی حقوق کا علمبردار ہے۔

۲۔ اسلام تمام انسانوں (چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم) کے درمیان عدل، انصاف، مساوات اور اخوت کی تعلیم دیتا ہے۔

۳۔ اسلام تمام انسانوں کو ہر طرح کی حق رائے آزادی دیتا ہے۔

۴۔ اسلام مسلمانوں پر لازم کرتا ہے کہ کسی غیر مسلم کی تذلیل نہ کریں بلکہ بحثیت انسان سب کی تکریم لازم ہے۔

۵۔ اسلام نے تمام انسانوں کو یکساں معاشی حقوق عطا کئے ہیں۔

۶۔ اسلام نے تمام انسانوں کو مکمل مذہبی آزادی عطا کی ہے۔

۷۔ اسلام غیر مسلم اقلیتوں کو ریاست میں رہنے والے مسلمانوں کے برابر ہر طرح کے حقوق دیتا ہے۔

۸۔ غیر مسلم مؤرخین بھی اس پر گواہ ہیں کہ اسلامی ریاست و خلافت میں غیر مسلم شہریوں کو ہر طرح کے حقوق حاصل تھے حتی کہ غیر مسلم اپنے ممالک کو چھوڑ کر اسلامی ریاست میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

۹۔ اسلام حالت جنگ میں بھی دشمن کے بچوں، عورتوں، بوڑھوں، مذہبی راہنماؤں حتی کہ مقابل نہ آنے والے تمام افراد کی جان، مال، عزت کو تحفظ دیتا ہے۔

۱۰۔ اسلام حالت جنگ میں بھی دشمن کی عبادت گاہوں کو منہدم کرنے سے منع کرتا ہے۔

تجاویز:

۱۔ ملکی سطح پر سکول وکالج کے نصاب میں انسانی حقوق کے متعلق اسباق شامل ہونے چاہئیں۔

۲۔ سوشل میڈیا والیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ملکی وبین الاقوامی سطح پر مذہبی نقطہ نظر سے انسانی حقوق کو اجاگر کیا جائے۔ مختصر موویز، تربیتی ڈرامے، ٹاک شوز، پروگرامز وغیرہ کروائے جائیں۔

۳۔ سفارت کے ذریعے غیر اسلامی ممالک میں کانفرنسز، پروگرامز، میٹنگز یا دیگر ذرائع سے اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں انسانی حقوق کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ اسلام کا پرامن چہرہ واضح ہو سکے اور دہشت گردی کی گرد صاف ہو۔

۴۔ اپنے ملک میں مذہبی نقطہ نظر سے انسانی حقوق پر بین الاقوامی سطح کے سیمینارز اور کانفرنسز کروائی جائیں، جن میں مختلف ممالک کی شخصیات کو دعوت دی جائے۔

☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

۱. القرآن الکریم

۲. احمد بن حنبل، (س۔ن)، المسند، مؤسسۃ قرطبہ، مصر۔

۳. بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، (۱۹۸۷ء)، الصحیح، دار ابن کثیر، بیروت۔

۴. ترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی ترمذی، (س۔ن)، السنن، مطبعۃ مصطفی البابی۔

۵. حصکفی، محمد بن علی بن محمد، (۱۳۸۶ھ)، الدر المختار، بیروت، دار الفکر

۶. دارمی، ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمن، (۲۰۰۰ء)، السنن، سعودی عرب، دار المغنی

۷. ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، (۱۹۹۴ء). السنن، تحقیق: شعیب الارنؤوط، دار الفکر، بیروت۔

۸. ابن ابی شیبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد، (۱۴۰۹ھ)، المصنف، ریاض، مکتبہ الرشد

۹. صنعانی، ابو بکر عبد الرزاق بن ہمام، (۱۴۰۳ھ)، المصنف، ہندوستان، المجلس العلمی

۱۰. ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، (۱۹۹۲ء)، رد المحتار علی الدر المختار، بیروت، دار الفکر

۱۱. قرافی، ابو العباس، احمد بن ادریس، (۱۹۹۸ء)، الفروق و انوار البروق فی انواء الفروق، دار الکتب العلمیہ

۱۲. مسلم، مسلم بن الحجاج، (۲۰۰۳ء)، الصحیح، بیروت، دار الفکر

۱۳. نسائی، ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی، السنن، مکتب المطبوعات الاسلامیۃ، حلب۔

۱۴. ہندی، علاء الدین علی بن حسام الدین، (۱۹۸۱ء)، کنز العمال، مؤسسۃ الرسالۃ

۱۵. ابو یعلی، احمد بن علی، (۱۹۸۴) المسند، دمشق، دار المامون للتراث

۱۶. ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، (س-ن)، کتاب الخراج، قاہرہ، المکتبہ الازہریہ

17. Hitti, Philip K, (1970), History of the Arabs, Tenth Edition, London, Macmillan Education Ltd

18. Watt, W. Montgomery, (1968) Islamic Political Thought The Basic Concepts, Edinburgh, Scotland, Edinburgh University Press

اعلیٰ اخلاقی اقدار اور حُسنِ معاشرت کی اہمیت

(اسلامی تعلیمات کی روشنی میں)

☆ فرح ناز

اسلام دینِ فطرت اور معاشرتی دین ہے۔ اس کی تمام تعلیمات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ افراد معاشرہ کا باہمی میل جول اور تعلقات کے قواعد وضوابط اسلامی تعلیمات کا حصہ ہیں۔ معاشرے کے ہر اچھے اور برے اخلاقی اقدار کو اللہ تعالی اوراس کے رسول ﷺ نے متعین کر دیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق جھوٹ، فریب و دھوکہ دہی، بدسلوکی و بے رحمی، بہتان طرازی، شراب نوشی و جوا بازی، زناکاری و بے حیائی، کبر و نخوت، جنگ و جدال اور ظلم و ستم، مطلب پرستی اور خود غرضی کا شمار برے اخلاق میں ہوتا ہے جبکہ حسنِ سلوک اور احسان و صلہ رحمی، محبت وشفقت، ہمدردی اور خیر خواہی، صدق گوئی اور سچائی، صبر و تحمل، امانت و دیانت، ایفائے عہد، خوش طبعی، تواضع، عدل و انصاف، رواداری اور مساوات و احترامِ نفس عمدہ اخلاقی اقدار کا آئینہ دار ہے۔ اس مضمون میں چیدہ چیدہ اخلاقی اقدار کی ایک جھلک پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسلامی تعلیمات کے عطا کردہ اعلیٰ اخلاقی اقدار پر عمل پیرا ہوکر ہی ایک بہترین اور مثالی انسانی معاشرے کی تشکیل ہو سکتی ہے۔

حسن اخلاق کے بغیر معاشرہ درندگی و بہیمیت کا بھیانک منظر پیش کرتا ہے۔ اسلام اعلیٰ اخلاقی اقدار کا علَم بردار دین ہے۔ داعی اسلام سیدنا محمد مصطفی ﷺ معلّمِ اخلاق اور کائنات میں حسنِ اخلاق کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾(۱)

"بے شک آپ بڑے عظیم اخلاق کے مالک ہے۔"

☆ پی۔ ایچ۔ ڈی اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف لاہور

(۱) القلم، ۶۸: ۴۔

اگر ہمارا معاشرہ اسلامی اخلاقی اقدار پر عمل پیرا ہو جائے تو بہت سی معاشرتی برائیاں خود بخود ختم ہو کر معاشرہ امن، اخوت اور بھائی چارہ کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَن.(۲)

''لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔''

اسلامی معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ حُسنِ اخلاق مؤمن کی پہچان ہے۔ نیک اعمال وافعال کی صحت اخلاق سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلْقًا (۳)

''مسلمانوں میں کامل ترین ایمان اس شخص کا ہے جس کا اخلاق سب سے بہترین ہو۔''

اسی طرح یہ بھی آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلاَقًا.(۴)

''تم میں بہتر وہ ہے جو تم میں اخلاق کے اعتبار سے بہتر ہے۔''

ایک مقام پر ارشاد نبویؐ ہے:

تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ.(۵)

''اپنے مسلمان بھائی کے سامنے تمہارا خندہ روئی سے پیش آنا تمہارے لیے صدقہ ہے۔''

طبرانی میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی روایت ہے کے مطابق آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

وَاخْزُنْ لِسَانَكَ إِلَّا مِنْ خَيْرٍ، فَإِنَّكَ بِذَلِكَ تَغْلِبُ الشَّيْطَانَ.(۶)

---

(۲) احمد بن حنبل، المسند، ۵: ۲۳۶، رقم الحدیث ۲۲۱۱۲۔

(۳) أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۲۵۰، رقم الحدیث ۷۳۹۶۔

(۴) بخاری، الصحیح، کتاب المناقب، باب صفۃ النبی ﷺ، ۳: ۱۳۰۵، رقم الحدیث ۳۳۶۶۔

(۵) ترمذی، السنن، کتاب البر والصلۃ والآداب، ۴: ۳۳۹، رقم الحدیث ۱۹۵۶۔

''اپنی زبان کو خیر کے سوا ہر چیز سے روکے رکھو، اس طرح تم شیطان پر غلبہ پاسکتے ہو۔''

دشمن کو زیر کرنے کے لئے عمدہ اخلاق و کردار سے بہتر کوئی اسلحہ نہیں۔ صحیحین کی روایت کے مطابق ایک مہم کے دوران صحابہ نے جب یمامہ کے سردار ثُمامہ ابن اُثال کو پکڑ کر بارگاہ نبوت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے اعلی اخلاق کا مظاہر ہ فرماتے ہوئے اسے رہا کرنے کا حکم دیا۔ وہ آپ ﷺ کے اس کردار سے اس قدر متاثر ہوا کہ قریبی باغ میں جاکر غسل کیااور دوبارہ آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں آکر مسلمان ہوا۔(۷)

حضور نبی اکرم ﷺ کے انہی اعلیٰ اخلاق کی بدولت عرب کے جاہلی معاشرے میں اعلی اخلاقی اقدار سے بھر پور انقلاب برپا ہوا اور صحابہ کرام کی زندگیاں عمدہ اخلاق کا اعلی نمونہ بنیں۔ یہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا ہی کرشمہ ہے کہ آج دنیاکے ہر خطہ میں اسلام کے نام لیوا موجود ہیں۔

انسانی معاشرہ کی اہمیت اور اسلامی تعلیمات:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں معاشرتی و سماجی زندگی بہتر گذارنے کے لئے جو اصول عطا کئے ہیں اس پر عمل پیرا ہونا اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ہو۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اخلاقی اقدار کا تعلق عقل و خرد سے نہیں۔ اسلام نے ہمیں خیر و شر کی تمیز کرنے کا جو علم دیا ہے وہی اصل ہے۔

انسانی معاشرہ میں خاندان کے ادارے کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عربی میں مادہ "عول" کے ذیل میں "عائلۃ" مصدر سے خاندان کا مفہوم واضح کیا گیا ہے مثلا عربی زبان میں سربراہ خاندان کے لئے "عیال الرجل" کی اصطلاح مستعمل ہے،لسان العرب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وعِيَالُ الرَّجُلِ وعَيِّلُه: الَّذِينَ يَتكفَّلُ بِهِمْ، وَقَدْ يَكُونُ العَيِّلُ وَاحِدًا وَالْجَمْعُ عالةٌ.(۸)

''آدمی کے عیال سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی وہ کفالت کرتا ہے،عیل واحد ہے اور اس کی جمع

---

(۶) طبرانی، المعجم الصغیر، ۲: ۱۵۶، رقم الحدیث ۹۴۹۔

(۷) بخاری، الصحیح، کتاب المغازی، باب وفد بني حنيفة وحديث ثمامة بن أثال، ۴: ۱۵۸۹، رقم الحدیث ۴۱۱۴۔

(۸) ابن منظور، جمال الدین اصمعی محمد بن مکرم، لسان العرب، بیروت دار صار، ۱۹۹۷ء، ۱۱: ۴۸۵۔

عالۃ ہے۔"

جو شخص اپنے کنبے کی کفالت کا فریضہ سر انجام دیتا ہے اور ان کے کھانے اور لباس کی ضروریات کی کفالت کرتا ہو وہ عیال الرجال کی تعریف میں آتا ہے۔

عَالَ عِيالَه يَعُولُهم إِذا كَفَاهم مَعاشَهم، وَقَالَ غَيْرُهُ: إِذا قَاتَهُمْ، وَقِيلَ: قَامَ بِمَا يَحْتَاجُونَ إِليه مِنْ قُوت وَكِسْوَةٍ وَغَيْرِهِمَا.(۹)

"عیال اسے کہا جاتا ہے جس کی معاشی طور پر کفالت کی جائے اور بعض نے کہا ہے کہ جب وہ ان کا خرچ اٹھائے اور بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کھانے پینے اور لباس کے لئے اس کے محتاج ہوتے ہیں۔"

تاج العروس میں باپ کی طرف سے رشتہ داروں کو خاندان کہا گیا ہے:

الأُسْرَةُ: أَقاربُ الرَّجلِ مِن قِبَلِ أَبِيه.(۱۰)

ابن خلدون اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"افرادِ انسانی کا اکٹھے مل جل کر رہنا ایک ناگزیر امر ہے اور یہ وہ حقیقت ہے۔ جسے اہل علم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مدنیت پسند واقع ہوا ہے۔"(۱۱)

معاشرتی تعلقات دراصل وہ سماجی مراسم و روابط کے بندھن ہیں جن سے کسی معاشرہ میں ایک ساتھ زندگی گزارنے والے سبھی افراد باہمی طور پر ایک دوسرے سے مربوط بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔

مغربی مفکر برٹرینڈ رسل کے مطابق انسان ایک معاشرتی جاندار ہے اور یہ اس کی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ رہے۔ دوستی کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ فراست پر مبنی ہے۔ لیکن اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو فہم

---

(۹) ایضا، ۱۱: ۴۸۶۔

(۱۰) زبیدی، محمد مرتضی، تاج العروس، دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء، ۱۰: ۵۱۔

(۱۱) ابن خلدون، عبدالرحمن بن خلدون (۸۰۸ھ)، المقدمہ، بیروت، لبنان، دار الکتب العلمیۃ، ۱۹۹۲ء، ص: ۴۹

عامہ سے بلند تر ہو۔(۱۲)

اس کرۂ ارضی پر انسانی زندگی کی استواری اور خوشگواری کا انحصار حسن معاشرت پر ہے۔ مرد اور عورت یعنی میاں بیوی کا رشتہ ہے جو خاندان کی بنیاد بنتا ہے۔ پھر یہ خاندان قبیلوں اور برادریوں کی صورت اختیار کرتے ہیں اور یہ قبیلے اور برادریاں مل کر معاشرہ وجود میں لاتے ہیں۔ نسل انسانی کے ابتدائی دور سے لیکر آج تک معاشرہ ارتقائی منازل میں داخل تو رہا، لیکن کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا جب معاشرتی تنظیم سے بالکلیہ گریز کیا گیا ہو۔ معاشرتی زندگی دوسرے انسانوں کے ساتھ سلوک، برتاؤ اور رویہ سے تشکیل پاتی ہے لوگوں سے خوشگواری اور خندہ پیشانی سے ملنا مسکرا کر ملنا ان سے شیریں کلام کرنا مہذب زندگی کی علامت ہے، رسول ﷺ کی عوامی اور سماجی زندگی کا یہ خوشنما اصول ہے جسے آپ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لأَهْلِي.(۱۳)

''تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے لئے بہتر ہو اور میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اپنے اہل خانہ کے لئے بہتر ہوں۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مبارکہ ہے:

مَا رَأَيْتُ أَحَدًا كَانَ أَرْحَمَ بِالْعِيَالِ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.(۱۴)

''میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ کسی شخص کو اپنے گھر والوں پر مہربان اور شفیق نہیں دیکھا۔''

حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا، میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں اور وہ قطع رحمی کرتے ہیں، میں ان سے احسان کرتا ہوں وہ میرے ساتھ برائی کرتے ہیں، میں ان سے بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جہالت کا معاملہ

---

(۱۲) برٹرینڈ رسل، فلسفہ مغرب کی تاریخ، ترجمہ از پروفیسر محمد بشیر، ص ۲۳۵

(۱۳) ترمذی، السنن، کتاب المناقب، باب فضل ازواج النبی ﷺ، ۵: ۷۰۹، رقم الحدیث: ۳۸۹۵۔

(۱۴) مسلم، الصحیح، کتاب الفضائل، باب رحمۃ الصبیان، ۴: ۱۸۰۸، رقم الحدیث: ۲۳۱۶۔

کرتے ہیں،تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَئِنْ كُنْتَ كَمَا قُلْتَ،كَأَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ وَلَا يَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللهِ ظَهِيرٌ عَلَيْهِمْ مَا دُمْتَ عَلَى ذَلِكَ.(۱۵)

''اگر معاملہ تمہارے کہنے کے مطابق ہے تو جب تک تم ایسا کرتے رہو گے،تب تک ان کے خلاف اللہ کی طرف سے ایک مددگار تمہارے ساتھ رہے گا۔''

حسن معاشرت میں خاندان کی اہمیت :

معاشرتی زندگی میں خاندان کو اکائی کی حیثیت ہے۔جس کی بنیاد میاں بیوی ہیں۔اسلامی تعلیمات میں دونوں کو الگ الگ ہدایات دی گئیں ہیں۔حضور نبی اکرم نے گھر والوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے والے کو معاشرے کا بہتر آدمی قرار دیا کہ تم میں بہتر شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے نفرت نہ کرے، اس لیے کہ اگر ایک بات ناپسند ہوگی تو دوسری کوئی بات ضرور پسند آئے گی۔اسی طرح شوہر کی رضا مندی کو عورت کے لیے جنت میں داخلے کا وسیلہ قرار دیاگیا۔

قرآن حکیم اور حضور ﷺ کی احادیث مبارکہ کی روشنی میں قرآن پاک میں خاندان کا ذکر بار بار آتا ہے۔قصہ یوسف میں ہے:

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ.(۱۶)

''پس جب وہ اس کے پاس داخل ہوئے تو کہنے لگے اے عزت والے ہمیں اور ہمارے خاندان کو سخت مصیبت پہنچی ہے۔''

وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِنَّا وَذِكْرَى لِأُولِي الْأَلْبَابِ.(۱۷)

---

(۱۵) مسلم، الصحیح، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب صلۃ الرحم وتحریم قطیعتھا، ۴: ۱۹۸۲، رقم الحدیث: ۲۵۵۸۔

(۱۶) یوسف ۱۲: ۸۸۔

''اور ہم نے اسے اس کے اہل وعیال اور ان کے ساتھ اتنے ہی مزید اپنی خاص رحمت عطا کئے اور یہ عقل رکھنے والوں کے لئے یاد دہانی ہے۔''

خاندان اور اس سے متعلقہ اصطلاحات کی جو تعریفات درج ذیل ہیں وہ بین الاقوامی مقالہ جات اور اقوام متحدہ کے اجلاس کی دستاویزات کے مطابق کچھ یو ں بیان کئے گئے ہیں۔خاندان،معاشرے کی ایک فطری اور بنیادی اکائی ہے، وسیع پیمانے پر ممکنہ تحفظ اور مدد وتعاون کا مستحق ہے۔(۱۸)

شادی کے ذریعے سے مختلف خاندانوں اور قبیلوں کے درمیان آپس میں تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ میاں اور بیوی کے عزیز واقارب سے خاندان تشکیل پاتا ہے۔ بقول خالدرحمان:

''اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک خاندان اگرچہ ایک مرد اور عورت کے نکاح کے عقد اور بندھن اور ان کے بچوں سے وجود میں آتا ہے لیکن اس میں شوہر کے والدین اور خونی رشتے کے عزیز بھی شامل ہو کر ایک وسیع خاندان کو تشکیل دیتے ہیں۔پھر اسلامی شریعت کے خصائص میں سے ہے کہ اسلام نسب ونسل کی حفاظت کو شریعت اسلامیہ کے عمومی مقاصد میں سے شمار کرتا ہے۔''(۱۹)

خاندان افراد کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی کو کامیابی سے گزاریں۔ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

''کسی معاشرے کے ادارے جتنے مضبوط،واضح اور منضبط ہوں گے معاشرہ اتنا مظبوط ہو گا ان کی وجہ سے معاشرے کو استحکام نصیب ہوتا ہے انہی کے سبب معاشرتی نظام کی تکمیل ہوتی ہے یہی وہ ذرائع ہیں جن سے ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے،ان اداروں کی ساخت فرد،سازوسامان تنظیم اور عمل پر مشتمل ہوتی ہے۔''(۲۰)

ان اداروں کے اپنے اپنے دائرہ کار ہیں جن میں یہ ادارے کام کرتے ہیں ان کے دائرہ کا ر کو یوں

---

(۱۷) ص،۳۸:۴۳۔

(۱۸) Universal Declaration of Human Right Artical,16-3۔

(۱۹) خالد رحمن،سلیم منصور،عورت خاندان اور ہمارا معاشرہ،انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈی،اسلام آباد،۲۰۰۷ء،ص۴۷۔

(۲۰) خالد علوی،ڈاکٹر،اسلام کا معاشرتی نظام،الفیصل ناشران لاہور،۲۰۰۵ء،ص۶۸۔

متعین کیا گیا ہے:

''معاشرتی ہم آہنگی،افراد کا نظم وضبط،معاشرتی احساس کی بیداری،مقاصد کی تکمیل،حقوق وفرائض کا خیال رکھتے ہیں اور یہ تمام انسانی معاشروں کی مشترکہ میراث ہیں۔''(۲۱)

معاشرتی زندگی کا اصل حسن احسان، ایثار،حسن معاملات، اخوت، رواداری اور قربانی سے جنم لیتا ہے۔ اسلام معاشرے کے ہرفرد خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، ہر ایک کے حقوق کا محافظ ہے۔ ہر ایک سے حسن معاشرت کی تعلیم دیتا ہے۔ارشاد نبوی ﷺ ہے:

أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ. (۲۲)

''آپس میں سلام کو رواج دو۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

السَّلاَمُ قَبْلَ الكَلاَمِ. (۲۳)

''گفتگو سے پہلے سلام ہے۔''

اسلامی تعلیمات میں معاشرے میں الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کرنے کی بجائے لوگوں کے ساتھ رہنے سہنے اور ملنے جلنے کی تحسین بیان کی گئی ہے۔ سرورِکائنات ﷺ کا ارشاد ہے:

الْمُسْلِمُ إِذَا كَانَ يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ خَيْرٌ مِنَ الْمُسْلِمِ الَّذِي لاَ يُخَالِطُ النَّاسَ وَلاَ يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ. (۲۴)

''جو مسلمان عام لوگوں سے میل جول رکھے اور ان کی طرف سے ہونے والی تکلیف دہ باتوں پر صبر اختیار کرے تو یہ ایسے مسلمان سے بہتر اور افضل ہے جو الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کرے اور

(۲۱) خالد علوی،ڈاکٹر،اسلام کا معاشرتی نظام،الفیصل ناشران لاہور،۲۰۰۵ء،ص۸۷۔

(۲۲) ابو داود، السنن، كتاب الأدب، باب في إفشاء السلام، ۴: ۳۵۰، رقم الحديث ۵۱۹۳۔

(۲۳) ترمذی، السنن، كتاب الإستئذان، باب ما جاء في السلام قبل الكلام، ۵: ۵۹، رقم الحديث ۲۶۹۹۔

(۲۴) ترمذی، السنن، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع، باب (۵۴)، ۴: ۲۶۲، رقم الحديث ۲۵۰۶۔

لوگوں کی تکالیف پر صبر اختیار نہ کرے۔"

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

مَا أَكْرَمَ شَابٌّ شَيْخًا لِسِنِّهِ إِلاَّ قَيَّضَ اللهُ لَهُ مَنْ يُكْرِمُهُ عِنْدَ سِنِّهِ. (۲۵)

"جو نوجوان بھی کسی بوڑھے شخص کا اس کی عمر کی وجہ سے ادب واحترام کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے بڑھاپے کے وقت ایسا شخص مقدّر فرمائے گا جو اُس کا ادب واحترام کرے گا۔"

یہ بھی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا، وَيُوَقِّرْ كَبِيرَنَا. (۲۶)

"جو شخص ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے، اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

اسلامی اخلاقی اقدار کا تقاضا ہے کہ افرادِ معاشرہ کا تعلق جس بھی قوم، برادری، رنگ ونسل یا مذہب سے ہو اس کا احترام کیا جائے۔ ہر قسم کی لڑائی، فتنہ وفساد اور ظلم سے اپنے آپ کو دور رکھیں یہی اسلامی اخلاقی اقدار ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ. (۲۷)

"جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا وہ خود رحم کیے جانے کا مستحق نہیں ہے۔"

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۲۵) طبرانی، المعجم الأوسط، ۶: ۹۴، رقم الحدیث ۵۹۰۳۔

(۲۶) أبویعلی، المسند، ۷: ۲۳۸، رقم الحدیث ۴۲۴۲۔

(۲۷) ۱- بخاری، الصحیح، کتاب الأدب، باب رحمة الولد وتقبیله ومعانقته، ۵: ۲۲۳۵، الرقم: ۵۶۵۱

۲- مسلم، ابو الحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم بن ورد قشیری نیشاپوری (۲۰۶- ۲۶۱ھ)- الصحیح- بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی، کتاب الفضائل، باب رحمته الصبیان والعیال وتواضعه وفضل ذلک، ۴: ۱۸۰۸، الرقم: ۲۳۱۸

من لا یرحم الناس لا یرحمہ اللہ تعالی-(۲۸)

”جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ ل رحم نہیں کرے گا۔“

قرآن و حدیث میں بے شمار اخلاقی اقدار کا ذکر ہے لیکن اس مقام پر صرف چند اخلاقی اقدار کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا تاکہ اخلاقی اقدار کے بارے میں شناسائی حاصل ہو جائے اور ان اخلاقی اقدار کو اپنی زندگی میں اختیار کرنے کا داعیہ بیدار ہوسکے۔ جتنی تفصیل کے ساتھ اخلاقی اقدار کی بابت اسلام کی تعلیمات ہیں کسی اور تہذیب یا مذہب میں اتنی تفصیل کے ساتھ اخلاقی اقدار کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔

بہبود عامہ اسلامی معاشرتی تنظیم کی بنیاد

اسلامی نظامِ معاشرتی بہبود اور اسلام کی روحانی اور اخلاقی اقدار میں گہرا تعلق ہے۔ اسلام کی یہ اقدار انسان کو ایثار، قربانی اور بے لوث خدمت خلق پر آمادہ کرتی ہیں۔ اسلام اپنے ضرورت مند بھائیوں کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے پر روحانی خوشی محسوس کرتا ہے۔ اسلام بے سہارا افراد اور دکھی اِنسانیت کی مدد و اِعانت پر بہت زور دیتا ہے۔ لوگوں کو بنیادی و معیاری تعلیم، صحت کی بنیادی سہولیات کی فراہمی، یتیموں کی بہترین انداز میں کفالت، معاشرے کے پسے ہوئے محروم طبقات کی داد رسی، ان کے اخلاقی و معاشرتی حقوق کا دفاع، لوگوں کے ساتھ حسنِ معاملات اور اِنفاق و خیرات کے ذریعے اِعانت کرنا خدمتِ اِنسانیت میں سرفہرست ہے۔ قرآن و حدیث نے واضح الفاظ میں صاحبِ ثروت لوگوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ معاشرے کے محروم طبقات کی دیکھ بھال کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جہنمیوں سے پوچھا جائے گا:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَO قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَO وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَO﴾(۲۹)

”(اور کہیں گے:) تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئیO وہ کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھےO اور ہم

---

(۲۸) ۱- مسلم، الصحیح، کتاب الفضائل، باب کثرة حیائه، ج ٤: ص ١٨٠٩، الرقم: ٢٣١٩

۲- ابن حبان، ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان التمیمی البستی (٢٧٠-٣٥٤ھ)- الصحیح- بیروت، لبنان: مؤسسة الرساله، ١٤١٤ ھ، ج ٢، ص ٢١١، الرقم: ٤٦٥

(۲۹) المدثر، ٧٤ : ٤٢-٤٤

محتاجوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھےO"

امیر المؤمنین سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

إنّ الله فرض على الأغنيآء في أموالهم بقدر ما يكفى فقراء هم-(۳۰)

"اللہ تعالیٰ نے دولت مندوں پر ان کے مال و دولت میں سے اس قدر انفاق فرض کیا ہے جس سے ان کے معاشرے کے ضرورت مندوں کی ضروتیں پوری ہو جائیں۔"

معاشرتی بہبود کے بنیادی اصول سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۷ میں بیان ہوئے۔ انہیں اُصولوں کو عہد رسالت کے آخر میں قانونی حیثیت دے کر حکومت اسلامیہ کی باضابطہ حکمت عملی قرار دیا گیا۔

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِىْ سَبِيْلِ اللهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللهِ ؕ وَاللهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌO﴾(۳۱)

"بے شک صدقات (زکوۃ) محض غریبوں اور محتاجوں اور ان کی وصولی پر مقرر کیے گئے کارکنوں اور ایسے لوگوں کے لیے ہیں جن کے دلوں میں اسلام کی الفت پیدا کرنا مقصود ہو اور (مزید یہ کہ) انسانی گردنوں کو (غلامی کی زندگی سے) آزاد کرانے میں اور قرضداروں کے بوجھ اتارنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں پر (زکوۃ کا خرچ کیا جانا حق ہے)۔ یہ (سب) اللہ کی طرف سے فرض کیا گیا ہے اور اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہےO"

اسلام معاشرے کے ہر فرد کو ایسی باعزت زندگی گزارنے کا حق دیتا ہے جس میں اس کے لئے مناسب لباس، مناسب غذا اور مناسب مکان فراہم ہو۔ اور معاشرے میں اس کو اس کے حسبِ حال مناسب عزت و احترام بھی میسر ہو۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّه، وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾(۳۲)

---

(۳۰) بیهقی، السنن الکبری، ۷ : ۲۳، رقم : ۱۲۹۸۵

(۳۱) التوبه، ۹: ۶۰

(۳۲) بنی اسرائیل، ۱۷: ۲۶

''اور قرابت داروں کو ان کا حق ادا کرو اور محتاجوں اور مسافروں کو بھی (دو)۔''

یعنی رشتہ دار مسکین اور مسافر کا حق دینا اسلامی اخلاقی اقدار میں شامل ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ما آمن بي من بات شبعانا وجاره جائع إلى جنبه وهو يعلم به.(۳۳)

''جو شخص شکم سیر ہو کر رات گزارے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے۔ اور وہ اس سے باخبر ہو تو وہ مومن نہیں۔''

قدیم معاشرے اور اسلامی تہذیب دونوں میں یہ بات اعلیٰ قدروں میں شمار ہوتی ہے کہ اپنے ہمسایوں کا خیال رکھا جائے۔ حدیث مبارکہ میں ہے:

لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِي يَشْبَعُ وَجَارُهُ جَائِعٌ إِلَى جَنْبِهِ.(۳۴)

''وہ مؤمن ہی نہیں ہے جو خود پیٹ بھر کر کھائے اوراس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔''

اسلام حسن معاشرت اور حسن اخلاق کا دوسرا نام ہے۔معاشرت کی پہلی اینٹ اخلاقِ حسنہ ہی ہیں۔ انسانیت کا زیور حسنِ اخلاق ہے۔ انسان اور جانور میں امتیاز اخلاقیات ہی سے ہے۔ اخلاقیات کے بغیر ہمار معاشرہ انسان نما درندوں کا منظر پیش کرتا ہے۔ انسان کی اخلاقی حس ہی اسے اپنے حقوق اور فرائض سے آگاہ کرتی ہے۔

اخلاقی اقدار کی ترویج اور حسن معاشرت:

اخلاقی اقدار کی روح اور اس کی بنیاد حُسنِ معاشرت ہے۔اسلامی معاشرے میں سب سے بلند مقام والدین کا ہے۔اسلامی معاشرت میں والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کی بڑی اہمیت ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

---

(۳۳) طبرانی، سلیمان بن احمد (۲۶۰۔۳۶۰ھ)،المعجم الکبیر، موصل، عراق: مکتبۃ العلوم والحکم، ۱۴۰۴ھ، ۱: ۲۵۹، الرقم: ۷۵۱

(۳۴) بیہقی، شعب الإیمان، ۷: ۷۶، رقم الحدیث ۹۵۳۶۔

﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾(۳۵)

''اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اُف تک نہ کہو اور نہ جھڑکو،ان سے اچھے لہجے میں بات کرو اور رحمت وانکسار کے ساتھ ان کے آگے جھک جاؤ اور ان کے لیے دعاکرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی تھی۔''

احادیث میں والدین کے حق کو جہاد فی سبیل اللہ سے بھی مقدم بتایاگیا ہے۔(۳۶)

اس کے بعد درجہ بہ درجہ معاشرے کے تمام افراد کے ساتھ اچھے اخلاقی رویہ رکھنے کا حکم ہے۔ حدیث کے مطابق اولاد کی تعلیم و تربیت کی پوری ذمے داری والدین پر ہے۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

''مرد اپنے گھروالوں کا نگراں ہے،اس سے اس کی رعیت کے بارے میں بازپُرس ہوگی۔(۳۷) اسی طرح نیک اولاد کو صدقہ جاریہ قرار دیاگیا ہے۔''(۳۸)

اولاد کی تعلیم وتربیت کی ہمہ جہت ذمہ داریاں ماں باپ کے کندھوں پرڈالی گئی ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اسلامی تعلیمات میں واضح ہدایات موجود ہیں۔مولانا شبلی نعمانی نے لکھاہے:

نیک تمناؤں اور دعاؤں کے طفیل میں جو اولاد وجود میں آئے گی وہ لازماً خاندانی اور معاشرتی اقدار کو استحکام بخشے گی قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

---

(۳۵) بنی اسرائیل،۱۷: ۲۳-۲۴۔

(۳۶) ابن أبی شیبۃ،المصنف،۴: ۲۰۱،رقم الحدیث ۱۹۳۰۸۔

(۳۷) أحمد بن حنبل،المسند،۲: ۵،رقم الحدیث ۴۴۹۵۔

(۳۸) ابن خزیمۃ، ۴: ۱۲۲،رقم الحدیث ۲۴۹۴۔

﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا﴾(۳۹)

"وہ دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے اللہ،ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیز گاروں کا امام بنا۔"

مقصد ہے کہ اولاد کو نیک وسعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی وسعادت مندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہئے تاکہ ظاہر وباطن کا حسن صورت وسیرت کی خوبیاں ان میں پیدا ہوں۔ شبلی نعمانی،سیرۃ النبی ﷺ،مکتبہ تعمیر انسانیت،لاہور،۱۹۷۵ء،ص۲۱۸

جو خاندان اور معاشرہ کو صحیح خطوط پر آگے بڑھا سکے۔یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نَحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ. (۴۰)

"والدین اپنی اولاد کو حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں دے سکتے۔"

بچوں کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا،ان کے طبعی رجحانات کو صحیح رخ پر ڈالنا اور انہیں ذہنی، جسمانی، عملی اور اخلاقی اعتبار سے بتدریج اس لائق بنانا کہ وہ اللہ کے شکر گذار بندے بن کر رہیں،کائنات میں اس کے مطابق تصرف کریں،نیز انفرادی عائلی اور اجتماعی حیثیت سے جو ان پر ذمہ داریاں ان کے خالق ومالک کی طرف سے عائد ہوتی ہیں ان سے کما حقہ عہدہ برآ ہوسکیں۔(۴۱)

میاں بیوی کو والدین کی حیثیت سے اولاد کی پرورش،بیٹیوں اور بیٹوں میں عدم تفریق اور دونوں میں مساوی سلوک کی ذمہ داریاں پایہ تکمیل تک پہنچانے کا پابند بنایا گیا اور اس بات پر خصوصی توجہ دلائی گئی کہ بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک کا رویہ اختیار کیا جائے. احادیث میں فرمایا گیا "جس شخص کو دو بیٹیوں سے نوازہ گیا اس نے ان کی اچھی پرورش کی،وہ روز قیامت میرے ساتھ یوں ہوگا آپ ﷺ نے دو انگلیوں کو ملا کر بتایا،صحابہ نے دریافت فرمایا کہ ایک بیٹی کی جس نے پرورش کی،تو آپ ﷺ نے اس کو بھی کہا اتنا ہی اجر ملے گا،اور جس نے تین بیٹیوں کی پرورش کی انہیں آداب سکھائے ان کی شادی کی وہ بھی جنت کا حق دار

---

(۳۹)الفرقان، ۲۵: ۷۴۔

(۴۰) ترمذی،السنن،کتاب الأدب والبر والصلة،باب ماجاء في أدب الولد،۴: ۳۳۸،رقم الحدیث ۱۹۵۲۔

(۴۱) افضل حسین،فن تعلیم وتربیت،مرکز جماعت اسلامی ہند،دہلی،۱۹۶۳ء ص۳۵۔

ہے۔(۴۲)

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ جس نے تین بیٹیوں کی پرورش کی اس پر صبر کا مظاہرہ کیا اچھا کھلایا پلایا تو اس کے اور جہنم کے آگ کے درمیاں حجاب قائم کردیا جائے گا۔(۴۳)

ایمان کے شجر سایہ دار کی شناخت حسن اخلاق سے ہے۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی بے چینی کا دارو اسلامی اخلاقی اقدار کو رواج دینے سے ممکن ہے۔ اسلامی اخلاقی اقدار کے فروغ دینے سے سب انسان امن و سلامتی کے ساتھ خوش گوار زندگی گزار کر سکتے ہیں اور ہمارا معاشرہ دنیا کے دیگر معاشروں کے لیے قابل فخر روایات کا مظہر بن سکتا ہے۔رسول اللہ ﷺ عرب کے ایسے معاشرہ میں مبعوث ہوئے جو اخلاقی گراوٹ اور نکبت کا شکار تھا۔اس معاشرہ میں اَخلاقی قدریں اس قدر پامال ہو چکی تھیں کہ وہ انسانی معاشرہ کی بجائے حیوانی معاشرہ کا منظر پیش کررہا تھا۔ برے اخلاقی کردار کے حامل اس معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی بات کرنا ایک عجوبہ تھا۔اس معاشرے میں حضور نبی کریمؐ کے اخلاق کریمانہ اور پاکیزہ اخلاق کا تذکرہ یوں کیا گیا:

> ”(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں، تمہاری تکلیف انہیں گراں معلوم ہوتی ہے اور وہ تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔ پھر اگر یہ لوگ پھر جائیں (اور نہ مانیں) تو کہہ دیجیے کہ اللہ میرے لیے کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔اسی پر میرا بھروسا ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔“(۴۴)

اسلامی معاشرہ گناہوں اور جرائم کے سدباب کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے، لہٰذا سلف صالحین سے ورثے میں ملنے والا معاشرہ اور قرآن وسنت سے ماخوذ تہذیب میں بڑی اصولی راہیں ملتی ہیں، مثلاً معاشرہ شرم وحیا سے آراستہ ہو، شرم وحیاء انسان کی ایسی مخصوص صفت ہے جو اسے "الغزش" کے موقع پر سہارا دیتی ہے اسی شرم وحیاء کا نتیجہ کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

---

(۴۲) احمد بن حنبل، المسند، ۳: ۳۰۳، رقم الحدیث ۱۴۲۸۶۔

(۴۳) ابو عوانۃ، المسند، ۲: ۴۸۶، رقم الحدیث ۳۹۳۷۔

(۴۴) التوبہ، ۹: ۱۲۸۔

الحَيَاءُ مِنَ الإِيمَانِ.(۴۵)

''حیاء ایمان کا حصہ ہے۔''

دوسرے مقام پر حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ الْحَيَاءَ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ.(۴۶)

''بے شک حیا ایمان کا ایک اہم شعبہ ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد نبوی ہے:

الحَيَاءُ لاَ يَأْتِي إِلَّا بِخَيْرٍ.(۴۷)

''حیا سے خیر ہی وجود میں آتی ہے۔''

نگاہوں اور شرم گاہوں کی حفاظت کے حوالے سے ارشاد ربّانی ہے: ایمان والوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔(۴۸) زنا اور حرام کاری جیسے مکروہ اور قبیح عمل کی ممانعت کے لیے قرآن پاک کی تعلیم ہے: زناکاری کے قریب بھی نہ جاؤ، وہ بڑی بے حیائی ہے۔(۴۹) اسلام میں مرد و زن کے اختلاط سے روکا گیا۔ پھر انسانی فطری ضرورت کی تکمیل کے لیے نکاح کی بابرکت سنّت

---

(۴۵) بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (۱۹۴-۲۵۶ھ)۔ الصحیح۔ بیروت، لبنان: دار ابن کثیر، الیمامہ، ۱۴۰۷ھ، ج۵، ص۲۲۶۸، الرقم:۵۷۶۷

(۴۶) ۱- ابن ماجه، ابو عبد الله محمد بن يزيد قزوينی (۲۰۷-۲۷۵ھ/ ۸۲۴-۸۸۷ء)- السنن- بيروت، لبنان: دار الفكر، باب فی الايمان، ج ۱، ص ۲۲، الرقم: ۵۸

۲- ابن ابی شيبه، ابو بكر عبد الله بن محمد بن ابی شيبه الكوفی (۱۵۹-۲۳۵ھ/ ۷۷۶- ۸۴۹ء)- المصنف- رياض، سعودی عرب: مكتبة الرشد، ۱۴۰۹ ھ، باب ما ذكر فی الحياء وما جاء فيه، ج ۵: ص ۲۱۲، الرقم: ۲۵۳۴۱

(۴۷) بخاری، الصحیح، کتاب الأدب، باب الحیاء، ۵: ۲۲۶۷، رقم الحدیث ۵۷۶۶۔

(۴۸) النّور:۲۴: ۳۰۔

(۴۹) بنی اسرائیل، ۱۷: ۳۲۔

بڑی اہمیت رکھتی ہے، پھر اسے آسان سے آسان تربنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

أَعْظَمُ النِّكَاحِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُ مَؤُنَةً. (۵۰)

"سب سے زیادہ بابرکت نکاح وہ ہے جس میں اخراجات سب سے کم ہوں۔"

بے حیائی سے سب سے زیادہ متاثر اخلاقِ انسانی اور نظام معاشرت ہوتی ہے۔ بے حیائی اور اختلاط مرد وزن سے معاشرے کا بگاڑ شروع ہوتا ہے۔ مولانا وصی مظہر ندوی لکھتے ہیں:

"کوئی شبہ نہیں کہ عورت اور مرد کے میل جول کی حالت میں نفس انسانی کو بہکنے کا موقع ملتا ہے اور شیطان کے لئے دوسروں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا غنیمت موقع ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس لئے اسلام نے اس سے منع کیا ہے۔"(۵۱)

مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

"وہ معاشرہ جو ایمان کی بنیاد پر قائم نہ ہو وہ بربادی اور ہلاکت کے پر خطر گڑھے میں پاؤں لڑھکائے ہوئے ہے اور ایک بھی معمولی سے اشارے پر اس کا اس میں گر جانا متوقع ہے اور یہ ممکن ہے کہ اس کی مدت کچھ بڑھ جائے یا اس کی طاقت کچھ مزید ابھرے لیکن اس کا انجام بربادی پر ہی ہوتا ہے۔"(۵۲)

بقول پروفیسر محمد سلیم نئی نسل نے غضب کر دیا تمام مسلمہ انسانی آداب اور معاشرتی روایات پر قینچی چلا دی اب وہ فی الواقع ماورِ پدر آزاد ہے۔"(۵۳)

رسول اللہ ﷺ صدق وسچائی کا مظہر اتم تھے۔ آپ ﷺ کی ذاتی زندگی سچائی ہی سے عبارت تھی۔ اس عادات مبارکہ کا اعتراف آپ ﷺ کے جانی دشمنوں کو بھی تھا۔ آپ ﷺ نے کوہ صفاء پر کفار مکہ سے دریافت کیا: "ھل وجدتمونی صادقاً او کاذباً" کہ مجھے تم لوگوں نے سچا پایا یا جھوٹا؟ توسب لوگوں نے برملا یک زبان ہو کر کہا:

---

(۵۰) اِسحاق بن راھویہ، المسند، ۲: ۳۹۴، رقم الحدیث ۹۴۶۔

(۵۱) وصی مظہر الدین ندوی، میثاق، ماہنامہ، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۱

(۵۲) ابوالحسن علی ندوی، مولانا، مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں، ساہیوال: مکتبہ رشیدیہ، ۱۹۷۴ء، ص: ۴۸

(۵۳) سلیم، پروفیسر سید محمد، مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، لاہور، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان، ۱۹۸۹، ص: ۱۳۰، ۱۳۱

مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ إِلَّا صِدْقًا.(۵۴)

''ہم نے تمہاری زندگی میں کبھی سچائی کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔''

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

ان الصدق يهدى إلى البر والبر يهدى إلى الجنة.(۵۵)

''بلا شبہ سچائی بھلائی کی جانب راہنمائی کرتی ہے اور بھلائی جنت کی راہ دکھاتی ہے۔''

اخلاقی اقدار کے نمایاں پہلوؤں میں سے ایک پہلو اخوت، بھائی چارہ اور رحمت و شفقت بھی ہے، بلکہ یہ ایسا فطری ملکہ ہے جو نہ صرف انسان بلکہ ہر جاندار میں پایا جاتا ہے اور نظامِ کائنات کی ترتیب و تنظیم میں اسکو بہت بڑا دخل ہے۔

رسول ﷺ کے حسن اخلاق کی تعلیمات رہتی دنیا تک کے لیے بنی نوع انسانیت کے لیے مینارہ نور اور شمع ہدایت ہے۔عفو و درگزر اسلامی اخلاق حسنہ کے بہترین مظاہر ہیں اور معاف کردینا اللہ کی بھی صفت عالیہ ہے۔رب کی رضا کی اسی میں ہے کہ اپنے بدترین دشمن سے بھی انتقام لینے کی بجائے اسے معاف کر دیا جائے اور ہر کسی کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آیا جائے۔ارشاد فرمایا:

اے (نبی ﷺ) آپ درگزر کا شیوہ اختیار کیجیے اور لوگوں سے اچھی بات کہیے۔''(۵۶)

تکلیف، مخالفت اور اذیت کو برداشت کرتے ہوئے دشمن کو معاف کر دینا درگزر کرنا اور تحمل و بردباری کا مظاہر کرنا اسلامی اخلاقی اقدار کا حصہ ہے۔ حضور ﷺ نے اپنے بدترین جانی دشمنوں کو﴿لَا تَثْرِيبَ

---

(۵۴) بخاري، الصحيح، كتاب التفسير، بابٍ وأنذر عشيرتك الأقربين واخفض جناحك ألن جانبك، ۴: ۱۷۸۷، رقم الحديث ۴۴۹۲۔

(۵۵) ۱- دارمی، أبو محمد عبد الله بن عبد الرحمن (۱۸۱-۲۵۵ھ)، السنن، بیروت، لبنان: دار الكتاب العربي، ۱۴۰۷ھ، باب فی الكذب، ج ۲: ص ۳۸۸، الرقم: ۲۷۱۵

۲-احمد بن حنبل، ابو عبد الله شيباني (۱۶۴-۲۴۱ھ/۷۸۰-۸۵۵ء)۔ المسند۔ بیروت، لبنان: المكتب الاسلامی للطباعة والنشر، ۱۹۸۷ء، ج ۱، ص ۴۰۵، الرقم: ۳۸۴۵

(۵۶) الاعراف، ۷: ۱۹۹۔

عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ فرما کر معاف کر دیا تھا۔[۵۷]

حضور نبی اکرم ﷺ اگر چاہتے تو بہ زور شمشیر مکہ مکرمہ فتح کر سکتے تھے لیکن آپ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد مکہ مکرمہ کی سرزمین واقعی امن کا گہوارہ بن گئی اور عظیم الشان فتح کی خونریزی یا انتقامی کاروائی کے بغیر اسلام کو نصیب ہوئی۔[۵۸]

اہل ایمان کا وجود دنیا کے لئے پیام امن ہے اس لئے آپ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد اعلان فرمایا: الیوم یوم بر و وفاء۔ آج نیکی اور ایفائے عہد کا دن ہے۔

گو عفو و درگزر اسلامی اخلاقی اقدار میں نہایت اہم نکتہ ہے۔ کسی کی طرف سے ناپسندیدہ بات اور تکلیف کو اللہ کے لئے معاف کرنا، رشتہ داروں دوستوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں۔

امن و آشتی سے حسن معاشرت

اسلام امن و آشتی اور انسانیت کی بھلائی کا درس دیتا ہے۔ اسلام نے دنیا کے مذہبی و سیاسی، علمی و فکری اور اخلاقی و معاشرتی پہلوں پر نہایت پاکیزہ اور دور رس اثرات مرتب کئے ہیں۔ امن وامان روئے زمین پر انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ امن نہیں ہے تو نہ عالم انسانیت کے ارتقاء کا عمل جاری رہ سکتا ہے، نہ معاشرتی زندگی کی بقا۔ ہر انسانی تحقیق اور ترقی کا وجود امن و سلامتی اور سکون سے ہے۔ اگر سکون ہی میسر نہیں ہے تو فکری اور عملی ترقی کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اسلامی تعلیمات میں امن و سلامتی معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام جب خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے اور اس وقت انہوں نے یہ دعا فرمائی تھی:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۝﴾[۵۹]

"اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے عرض کیا: اے میرے رب! اسے امن والا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں کو

---

(۵۷) ابن سعد، الطبقات الکبری، ۲: ۱۴۲۔

(۵۸) ابن سعد، ابو عبد اللہ محمد (۱۶۸-۲۳۰ھ)۔ الطبقات الکبری۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۳۹۸ھ، ۲: ۱۴۲

(۵۹) البقرہ، ۲: ۱۲۶

طرح طرح کے پھلوں سے نواز (یعنی) ان لوگوں کو جو ان میں سے اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لائے، (اللہ نے) فرمایا اور جو کوئی کفر کرے گا اس کو بھی زندگی کی تھوڑی مدت (کے لیے) فائدہ پہنچاؤں گا پھر اسے (اس کے کفر کے باعث) دوزخ کے عذاب کی طرف (جانے پر) مجبور کر دوں گا اور وہ بہت بری جگہ ہےO"

معاشرہ جب بدامنی کا شکار ہو تو ہر شخص دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ ایسے میں حقیقتاً دنیا ظالم اور مظلوم کے خانوں میں بٹ جاتی ہے جس سے پورا معاشرہ فاسد ہو جاتا ہے، ارتقائی عمل رک جاتا ہے اور بدامنی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام تمام انسانیت کو امن و اخوت اور محبت کی تلقین کرتا ہے تاکہ پر امن فضا میں اپنی فکری اور تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لا کر معاشرتی ارتباط کے لئے نفع بخش بنیں۔ خیر امت ہونے کی وجہ سے مسلمان امام اقوام کہلا سکیں اور نتیجتاً تمام افرادِ معاشرہ ان سے فیض حاصل کر سکیں۔

یہ بات تو درست ہے کہ قرآن کریم میں جہاد کا حکم موجود ہے مگر جہاد کا مقصد ہرگز دہشت گردی، بدامنی اور تشدد پھیلانا نہیں بلکہ اس کا واضح مقصد تشدد کا خاتمہ اور معاشرتی امن کا قیام ہے۔ جہاد سے متعلق آیات قرآنیہ کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک آیت کریمہ میں بھی یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ مسلمان، جہاد کے نام پر کسی پر ظلم و تشدد روا رکھ کر نقصان پہنچاتے پھریں۔

معاشروں کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ مشترکہ اخلاقی اقدار کی بناء پر تمام معاشرے آپس میں امن اور صلح جوئی کے عمل کو ترجیح دیں۔(۶۰)

اخلاقی اقدار کا احیاء ہی وہ ذریعہ ہے جو مستقبل کے انسان کو اس کے پیدائشی حقوق فراہم کر سکتا ہے اور عالمگیریت کے نام پر مغربی تہذیب و افکار کی یلغار کو روک کر مثبت طور پر ایک نئے اخلاقی نظام کو نافذ کر سکتا ہے۔ اس نئے اخلاقی نظام کی بنیاد جن اصولوں پر ہو گی ان میں وحدت انسانیت اور وحدانی شخصیت کے معاشی و سیاسی اور معاشرتی نظام کا نافذ کرنا شامل ہے۔ اس نئے اخلاقی نظام کی پہچان اس کا رنگ و نسل اور زبان و وطن کی قید سے آزاد ہونا اور تمام انسانی برادری کے ساتھ عادلانہ رویہ اختیار کرنا ہے۔ عدل و انصاف پر مبنی رویہ سے مراد وہ نظام ہے جس سے ہر فرد کو وہ مقام دیا جائے جس کا وہ مستحق اور تمام انسانوں کی بنیادی ضروریات اور حقوق کو یکساں تصور کیا جائے۔

معاشرتی امن اور سلامتی کی بقا کے لئے اسلام کے اخلاقی اقدار یہ ہیں کہ مسلم و غیر مسلم دونوں طبقوں کے

---

(۶۰) جہاد اور بلاد عالم، ص: ۱۱۲

مابین باہمی تعاون کی فضا قائم رہے تاکہ معاشرتی و سماجی مصلحت متحقق اور انسانی بھلائی ہر طرف عام ہو جائے۔ اس امر کی وضاحت حلف الفضول سے بھی ہوتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی موجودگی میں کمزوروں کی امداد، حاجت مندں کی حاجت روائی، ستم رسیدوں کی دادرسی، مصیبت زدوں کی دلجوئی اور مظلوموں کی ضمانت کی لیے دورِ جاہلیت میں ایک معاہدہ طے پایا تھا جس کی اہمیت و افادیت اور قدر و منزلت سے دنیائے انسانیت کو واقف کراتے ہوئے حضور نبی اکرم ﷺ نے جو کچھ فرمایا اس کو حضرت طلحہ بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم ولو ادعى به في الإسلام لاجبت۔(٦١)

''میں عبد اللہ بن جدعان کی رہائش گاہ پر ایک ایسے معاہدہ (حلف الفصول) میں شریک تھا جس کے بدلے میں مجھے سرخ اونٹ بھی پسند نہیں اور جس کے لیے اس دورِ اسلام میں بھی اگر مجھے آواز دی گئی تو میں ضرور لبیک کہوں گا۔''

معاشرتی حسن اور ترقی کے لئے ایک ضروی امر بین الممالک ہم آہنگی کو فروغ دینا ہے۔ دوسرے معاشروں کے عوام سے استفادہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشروں کے درمیان امن کا قیام ہو امن کے قیام کے درمیان معاشرتی ترقی کا قیام ناممکن ہے۔(٦٢)

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری لکھتے ہیں:

''یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی معاشرہ اس وقت ترقی نہیں کر سکتا جب تک ایک ملک دوسرے ملک کے ساتھ پر امن تعلقات کو فروغ نہ دے۔''(٦٣)

معاشرتی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ افراد معاشرہ اخلاقی اقدار کے حامل ہوں۔ صداقت و سچائی، امانت دیانت، عدل و انصاف امن و سکون اور باہمی احترام اور حقوق کی ادائیگی کسی بھی فلاحی معاشرہ کے نمایاں اخلاقی اقدار

---

(٦١) بیہقی، السنن الکبری، ٦: ٣٦٧، رقم: ١٢٨٥٩

(٦٢) مصطفی سباعی، اسلام کا نظام امن و جنگ، ص: ٢٩۔٣١

(٦٣) محمد طاہر القادری، ڈاکٹر، مقدمہ سیرت الرسول ﷺ، ٢: ص: ٦٥٥، ٦٨٨

ہوتے ہیں جبکہ سماج کے مختلف طبقات کے باہمی کشمکش، امیر و غریب کے مابین فرق، نسلی و نسبی اور صوبائی عصبیت، بے بس و بے کس لوگوں کی تحقیر و تذلیل سے معاشرہ فسادات کے لپیٹ میں آکر عدم سکون کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

اعلیٰ اخلاقی اقدار اور حسن معاشرت کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ یہ صالح اور مہذب معاشرے کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

نتائج بحث

معاشرتی زندگی کے تمام شعبوں میں جب تک اخلاقی اقدار کا فروغ نہیں ہوگا اس وقت تک کوئی بھی معاشرہ فعال کردار ادانہیں کرسکتا کسی بھی معاشرے کی بنیادی خصوصیات میں جب اخلاقی اقدار کا رنگ نہیں چڑھے گا اس وقت تک معاشرہ اپنی خصوصیات میں کامل نہیں ہوگا۔ عصر حاضر میں جو اقوام عروج و ترقی میں سب سے آگے ہیں وہ مسلمہ اخلاقی اقدار کی پابندی میں بھی مثالی رویے کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ زوال پذیر اقوام جو ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے ہیں وہ اخلاقی اقدار کی پابندی کے معاملے میں بھی بدترین انحطاط کا شکار ہیں۔

مغربی تہذیب و ثقافت کے زیر اثر نوجوان نسل کے معاشی اور سماجی تصورات زندگی بدل رہے ہیں۔ اخلاقی، عائلی، سماجی اور معاشرتی قدریں کمزور پڑتی جا رہی ہیں اور نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ فحاشی، عریانی اور بے راہروی کے سیلاب نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار نے معاشرتی قدروں کو نام نہاد جدت پسندی کا رخ دے کر خطرناک حد تک پامال کر دیا ہے، اسلامی تعلیمات اور فلسفہ اخلاق سے ناآشنائی کے باعث ہم محض نام کے مسلمان رہ گئے ہیں اور ہمارا مضحکہ خیز ظاہری تشخص بقول اقبال یوں ہے۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود(۶۴)

اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کرے۔ کوئی بھی انسانی معاشرہ اس وقت تک اپنے مقاصد کو حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ

(۶۴) کلیاتِ اقبال اردو (بانگ درا)، اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۳۱

ایک دوسرے کے سماجی، معاشرتی اخلاقی حقوق کی ادائیگی نہ کرے۔ لہذا ضروری ہے کہ اسلام کے اخلاقی، معاشرتی اور سماجی و سیاسی نظام کی بنیادی اقدار و اوصاف کو بیان کیا جائے تاکہ معاشرے کی تشکیل و تعمیر صحیح معنوں میں کی جا سکے۔

اخلاقی قدریں آفاقی ہوتی ہیں اور وہ نسل در نسل اپنی اہمیت برقرار رکھتی ہیں۔ معاشرے کا وہ طبقہ جو بھلائی کے جذبے سے سرشار ہے اسے لازمی طور پر آسان طرز عمل کو اختیار کرنا چاہئے جو واقعتاً زندگی میں ایک بہتر مقام بنانے میں مددگار ثابت ہوں۔